طلوعِ اسلام

مئی ★ ۱۹۵۳

-/10/-

مقصد طلوعِ اسلام کا مسلک اور

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

١. تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

٢. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس سے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

٣. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

٤. حضور نبی اکرم [illegible]
[illegible]
کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

٥. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان [illegible]
ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

٦. [illegible]
[illegible]
[illegible] لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

٧. [illegible]
[illegible]

٨. [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
نور سے جگمگا اٹھے۔

[illegible]

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۶	مئی سنہ ۱۹۵۳ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۴	باب المراسلات	۴۱-۴۶
لمعات	۵-۱۴	(۱) اقرب کا قرآنی مفہوم (علامہ اسلم جیراجپوری)	
معراج نبوی صلعم کے دو رُخ	۱۹-۲۵	(۲) مولانا تمنا کے نام (محترم عرشی صاحب)	
۱- محترم پرویز صاحب		منکر حدیث کون ہے؟	۴۷-۶۳
۲- سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی		آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔	۶۴-۶۵
کیا اسلام میں نظام جاگیرداری کی گنجائش ہے؟	۲۶-۴۰	اعجاز القرآن	۶۷-۷۴
(سید مناظر احسن صاحب گیلانی)		(محترم علامہ تمنا عمادی)	

سیرت صاحب قران خود قران کے آئینہ میں

معراج انسانیت

معارف القرآن - جلد چہارم

ترجمان حقیقت، جناب پرویز کے قلم سے جو فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب - شروع میں قریب پونے دوسو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے - اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں —

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ - جلد مضبوط اور حسین - گردپوش مرصع اور دیدہ زیب - ٹائٹیل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین - قیمت بیس روپے (۲۰) - محصول ڈاک و پیکنگ ایکروپیہ ساڑھے چھ آنے —

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز

ضخامت چارسوصفحات　　قیمت چار روپے　　محصولڈاک نو آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی

قرآن نے کیا کہا؟

ملک میں غلے کی کمی ہے۔ لوگوں کو ضرورت کے مطابق اناج نہیں ملتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے زمیندار اپنے غلے کو روک لیتے ہیں۔ اس کے انسداد کے لئے حکومت قانون بناتی ہے کہ کوئی زمیندار اپنی ضرورت سے زیادہ غلہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اسے فاضلہ اناج سب کا سب حکومت کی تحویل میں دیدینا ہوگا تاکہ اسے لوگوں کی ضرورت کے مطابق تقسیم کیا جا سکے۔ حکومت کا یہ اقدام، وقت کے تقاضے کے مطابق ہے اس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔

لیکن دوسری طرف، زمینداروں کا یہ کہنا ہے کہ حکومت خود تسلیم کرتی ہے کہ زمین کے ہم مالک ہیں۔ جب ہم زمین کے مالک ہیں تو اس کی پیداوار بھی ہماری ملکیت ہے۔ اب جس چیز کو قانوناً ہماری ملکیت تسلیم کیا جاتا ہے اس میں کسی کو تصرف اور دست اندازی کا حق حاصل نہیں ہونا چاہئے۔ ملکیت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس چیز کا استعمال مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔

ملکیت کے اس احساس سے زمیندار، حکومت کے مذکورہ صدر اقدام کو خوش آئند تصور نہیں کرتے۔ وہ اول تو کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح قانون سے پہلوتہی کی جا سکے اور اگر ایسا نہیں کر پاتے تو فاضلہ غلہ طوعاً و کرہاً حکومت کو دیتے ہیں۔ بطیب خاطر نہیں دیتے۔ اس سے بہرحال دلوں میں خوشگواری نہیں رہتی۔

قرآن نے کہا کہ یہ سب خرابی تمہاری ایک بنیادی غلطی کی وجہ سے ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ تم نے زمین کو انفرادی ملکیت میں دے رکھا ہے۔ زمین نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ ہے اور دوسرے ذرائع پرورش (پانی، ہوا، روشنی، حرارت) کی طرح یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہئے (سواء للسائلین ۴۱/۱۰)۔ تمام زمین معاشرہ کی تحویل میں رہے اور اس کی پیداوار کی تقسیم ضرورت کے اعتبار سے کی جائے۔

اس طرح نہ زمینداروں کے دل میں ناخوشگواری کے احساسات پیدا ہوں گے اور نہ ہی حکومت کو الگ قوانین بنانے پڑینگے۔

وہ طریق خدا کا تجویز کردہ ہے اور یہ انسانوں کا۔ اب دیکھ لو، دونوں میں فرق کس قدر ہے۔ یہ تمہاری مرضی ہے چاہے اسے جاری رکھو اور اس کے نتائج بھگتو۔ اور چاہے اسے اختیار کر لو اور معاشرہ کو سکون و طمانیت کی جنت بنا لو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

روایت ہے کہ جب نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ اس لئے رکھتے ہیں کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کے استبداد سے نجات ملی تھی، تو آپ نے فرمایا کہ اس تقریب میں تو ہمیں بھی شریک ہونا چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے بھی عاشورہ کا روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ ساعت جس میں قوم کو کسی مستبد کے جور و ستم سے نجات ملے، بڑی سعید ساعت ہوتی ہے اور اس قابل کہ اس کا جشن منایا جائے۔ ملتِ پاکستانیہ نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت ٹوٹنے پر جس اطمینان و مسرت کا اظہار کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قوم نے محسوس کیا ہے کہ اس کے سر سے غم و آلام کا پہاڑ اتر گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یوں تو اس سے پہلے کے زمانے میں بھی ملک ترقی کے زینے پر نہیں چڑھ رہا تھا۔ اُسوقت ملک میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت اس فراوانی سے گردش کر رہی تھی کہ بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہو سکا کہ قوم کے چہرے پر جو سرخی نظر آ رہی ہے وہ خونِ صالح کی رنگینی نہیں بلکہ

یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

لیکن گذشتہ ڈیڑھ برس میں یہ بدبخت ملک جس تیزی سے تباہی اور بربادی کے جہنم میں دھکیلا گیا ہے، اس کی نظیر شاید ہی مل سکے اس حکومت کی مثال اس کارندے کی سی ہو گئی تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

اینما یوجھہ لا یات بخیر (۱۶/۷۶)

اسے کہیں بھیجئے۔ کبھی خیر کی خبر لے کر نہیں آئے گا۔

پھر مصیبت یہی نہیں تھی کہ ملک پر اس بری طرح سے تباہی آ رہی تھی۔ اس سے بڑھ کر مصیبت یہ تھی کہ اس تباہی کو تباہی کہنا جرم قرار پا گیا تھا۔ حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے کہ قوم پر ایک عالمگیر مایوسی چھا چکی تھی۔ لوگ کہنے لگ گئے تھے کہ اس آزادی سے تو وہ غلامی ہزار درجے اچھی تھی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بالآخر اس مصیبت کا حل کیا ہوگا! انھیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ تازہ واردانِ بساطِ حکومت جو ایک خانہ ساز ملی بھگت سے اقتدار کی مسندوں پر قابض ہو چکے ہیں، کبھی ان کرسیوں کو نہیں چھوڑیں گے وہ اپنے جی میں سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ جرِ ثقیل جو قوم کے سینے پر کابوس بن کر سوار ہو چکا ہے کبھی نیچے نہیں اترے گا۔ ظاہر ہے کہ قوم پر اسقدر مایوسی کا چھا جانا بڑا خطرناک ہوا کرتا ہے۔ اس کے انجام و عواقب بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ قومیں ہمیشہ امیدوں کے سہارے جیتی، اور آرزوؤں کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہیں۔ جب کسی قوم کے دل میں نہ امید کی کوئی کرن باقی رہے نہ آرزو کا ولولہ

تو اس کے نتائج بڑے ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔

محترم غلام محمد صاحب کے اس پُرعزم اقدام نے قوم کی مایوسی کو امیدوں سے بدل دیا ہے۔ جدید وزارت کس قسم کی ثابت ہوگی اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن محض اس تبدیلی سے قوم کو پھر سے سانس آنے لگ گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے مایوس کُن حالات میں صرف اتنی سی تبدیلی بھی ایک گراں بہا نعمت ہوتی ہے، ان کے اس جواں ہمت اقدام پر ملت پاکستانیہ نے جن جذبات سپاس گذاری و احسانمندی کا اظہار کیا ہے وہ فی الواقعہ اس کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔ اس کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان جانے والوں کے متعلق ملک کے کسی گوشے اور کونے سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی سننے میں نہیں آیا۔ قرآن کے الفاظ میں فما بکت علیھم السماء والارض (۴۴/۲۹) "نہ ان پر آسمان رویا نہ زمین"۔ کس قدر عبرت انگیز ہے یہ انجام۔ فھل من مدکر (کیا کوئی ہے جو اس سے عبرت حاصل کرے؟)۔

لیکن یہ سب کچھ، اپنی بیش بہا خوبیوں کے باوجود ایک ہنگامی واقعہ ہے۔ قرآن جس تصور کو لیکر آیا تھا وہ انسان کو اس سے بہت اونچا لے جاتا ہے۔ قرآن سے پہلے ذہن انسانی کی کیفیت یہ تھی کہ وہ زندگی کو شخصیتوں کے ساتھ وابستہ سمجھتا تھا۔ وہ درحقیقت ذہن انسانی کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ آپ کسی بچے کو دیکھئے۔ اس کی تمام امیدیں اور آسرے شخصیتوں کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ وہ گرتا ہے تو امی کو پکارتا ہے۔ اسے کہیں سے خطرے کا احساس ہوتا ہے تو ابا کو آواز دیتا ہے۔ وہ اکیلا اندھیرے میں نہیں جاتا۔ جب تک کوئی انگلی پکڑ کر چلانے والا ساتھ نہ ہو، وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اس کی ساری زندگی انہی سہاروں سے قائم ہوتی ہے۔ وہ انہی آسروں کے بل بوتے پر جیتا ہے۔ جو حالت بچے کی ہوتی ہے، وہی حالت نوعِ انسانی کی اس زمانے میں تھی جب اس کا ذہن ہنوز عالمِ طفولیت میں تھا۔ اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کی ساری مشینری ایک شخصیت کے گرد گھومتی تھی جسے بادشاہ کہا جاتا تھا۔ جس قسم کا بادشاہ ہوتا اسی قسم کا معاشرے کا نقشہ ہوتا۔ وہ نیک کردار ہوتا تو معاشرے میں نیک عملی کو فروغ ہوتا۔ وہ بدکردار ہوتا تو بدکرداری عام ہو جاتی۔ وہ شمشیر افگن ہوتا تو قوم کے جوہر مردانگی ابھر آتے۔ وہ شمشیر باز ہوتا تو ساری قوم شمشیر لڑانے لگ جاتی۔ وہ مدبر اور جہاندار ہوتا تو ملک کی حالت سدھر جاتی۔ وہ نالائق اور کوتاہ اندیش ہوتا تو قوم میں ابتری پھیل جاتی۔ وہ طاقتور اور باہمت ہوتا تو کسی کا حوصلہ نہ پڑتا کہ اس مملکت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ جائے۔ وہ کمزور اور پست حوصلہ ہوتا تو چاروں طرف سے مخالفتوں کا طوفان امنڈ آتا۔ غرضیکہ زندگی اور اس کے تمام تضمنات، اس ایک شخصیت کے گرد گھومتے۔ یہانتک کہ جنگ کے زمانے میں اگر بادشاہ قتل یا گرفتار ہو جاتا تو اس کا ملک فتح ہو جاتا (خواہ اس کے جیوش و عساکر کتنے ہی مہیب اور طاقتور کیوں نہ ہوتے) جنگ تو ایک طرف، بحالتِ امن بھی بادشاہ کی موت ملک میں بالعموم انتشار پیدا کر دینے کا موجب ہو جاتی تھی۔ اور اس کے جانشین کو نظم و نسق کے قیام کیلئے بڑی سخت گیری سے کام لینا پڑتا تھا۔

جو کچھ ہیئتِ اجتماعیہ کے شعبے میں بادشاہ کی حیثیت تھی، وہی کچھ زندگی کے دیگر دوائر میں، دوسری ممتاز شخصیتوں کی حالت تھی، فوج کا سپہ سالار گرفتار ہو گیا تو ساری فوج کو شکست ہو گئی۔ قبیلے کے سردار کو قید کر لیا گیا تو سارا قبیلہ مطیع و فرمانبردار ہو گیا۔ بزرگِ خاندان

مرگیا تو خاندان میں ابتری پھیل گئی۔ مندر کا پوجاری (برہمن، پیشوا، مولوی، پیر) بیمار ہوگیا تو "خدا اور بندوں" کے تمام تعلقات منقطع ہوگئے۔ اب نہ کوئی ان کی دعائیں وہاں تک پہنچانے والا ہے نہ اِن کے نذرانے اس کے حضور پیش کرنے والا۔ نہ ان کی سفارش کرنے والا ہے نہ اِنھیں اس کی خفگی سے بچانے والا۔ جب تک پروہت کی شخصیت درمیان میں نہ ہو، قوم کی عبادت گذاری کی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہوسکتی۔

یہ تھی حالت انسان کی اس زمانے میں جب اس کا ذہن ہنوز بختگی تک نہیں پہنچا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ اب انسانی شعور کی پختگی کا دور آرہا ہے۔ اس لئے اب اس کی زندگی کو شخصیتوں کے سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب بچہ جوان ہو رہا ہے اس لئے اسے کسی انگلی پکڑ کر چلانے والے کی حاجت نہیں ہوگی۔ اب اسے صرف اتنی ضرورت ہوگی کہ راستے بنے ہوئے ہوں۔ ان کے دوراہوں پر (SIGN-POSTS) لگے ہوں۔ باہر روشنی موجود ہو اور اس کی آنکھوں میں بصارت۔ اس کے بعد اسے کسی اور آسرے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قرآن نے کہا کہ اب دنیا میں تبدیلیاں اشخاص کی بجائے تصورات (IDEOLOGIES) کی بنا پر ہوا کریں گی۔ اب شخصیتوں کی جنگ نہیں ہوگی، بلکہ نظریات کا مقابلہ ہوگا۔ اب یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کونسا بادشاہ اچھا ہے اور کونسا بُرا۔ اب یہ دیکھا جائے گا کہ کونسا نظام اچھا ہے اور کونسا خراب۔ اب بلندی اور سرفرازی اس نظریہ کو ہوگی جو زندگی کی خوشگواریوں کا ضامن ہوگا۔ الیہ یصعد الکلم الطیب (۳۵/۱۰) "خوشگوار نظریۂ زندگی اس کی طرف بلند ہوگا" والعمل الصالح یرفعہ (۳۵/۱۰) "اور اس کی یہ سربلندی صلاحیت بخش پروگرام کے بل بوتے پر ہوگی"۔ خوشگوار نظریۂ زندگی کی مثال (ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ) اس شجرِ طیب کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں (کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابتٌ وفرعھا فی السماء)۔ اسی کو بقا ہوگی اور یہی ثمر بار ہوگا (توتی اکلھا کل حین باذن ربھا)۔ یہ نظریۂ حیات، خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہمیشہ اپنے پھل دیتا رہے گا)۔ یہ تھا وہ انقلاب عظیم جس کا اعلان قرآن نے کیا۔ اس نے کہا کہ اب شخصیتوں کے دور ختم ہوگئے۔ اب نہ "انسانوں کی دنیا" میں کسی بادشاہ کی ضرورت ہوگی اور نہ "خدا کی مملکت" میں کسی پروہت کی۔ اب وہاں بھی قانون اور نظام کا دور دورہ ہوگا اور یہاں بھی آئین اور نظام کی کارفرمائی۔ حتیٰ کہ (اس نے یہ بھی بتا دیا کہ) "انسانوں کی دنیا" اور "خدا کی مملکت" کی یہ تقسیم بھی انسان کی غلط نگہی کا نتیجہ تھی۔ خدا کا قانون بھی ایک ہے اور ساری مملکت بھی ایک۔ اس لئے اب انسانی زندگی کے ہر شعبے میں کارفرمائی صرف قانون اور نظام کی ہوگی۔ جس قسم کا قانون ہوگا اسی قسم کا انسانی معاشرہ ہوگا۔ جہاں جس قسم کا نظام ہوگا اس معاشرہ کی ویسی ہی حالت ہوگی۔ معاشرہ کی حالت، درحقیقت اس نظام کا پھل ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جیسا درخت ہوگا ویسا ہی اس کا پھل ہوگا۔ اچھے سے اچھے مالی کی ہنرمندی اور حسن کارکردگی شجرۃ الزقوم (تھوہر کے درخت) میں کبھی انگور نہیں لگا سکتی۔

یہ ظاہر ہے کہ نظام بالآخر افراد ہی کے ہاتھوں متشکل ہوگا۔ (بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قانون افراد کے ہاتھوں عملی شکل میں آجاتا ہے تو اسے نظام کہتے ہیں) اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام میں بھی شخصیتوں سے مفر نہیں ہوسکتا۔

قرآن نے اس حقیقت کو بھی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ نظام، اشخاص کی بجائے پوری کی پوری ملت کے ہاتھوں قائم ہوگا اس لئے نظام کے لئے ضرورت ہوگی (i) قانون اور (ii) جماعت کی۔ نہ کہ شخصیتوں کی۔ اشخاص آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ لیکن ملت ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل موجود رہتی ہے۔ اسی بنا پر اس نے کہا کہ اب شخصیتوں کی بجائے، اُمم کا دور آگیا ہے۔ اب بحث اقوام سے ہوگی، اشخاص سے نہیں ہوگی۔ اور جب کوئی تصور (IDEOLOGY) کسی امت کے ہاتھوں عملی شکل اختیار کریگا تو اسے نظام کہا جائے گا۔

اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے اس نے خود ذاتِ رسالتمآبؐ کو بہ حیثیت دلیل اور نمونے کے پیش کر دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک نبی اکرمؐ سے زیادہ بلند شخصیت اور کس کی ہو سکتی ہے؟ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے خود حضور رسالتمآبؐ سے کہدیا کہ اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے کہ یہ نظام دو چیزوں پر قائم ہے ایک وہ قانون جو تمہیں ہماری طرف سے ملا ہے اور دوسرے یہ جماعت جس کے ہاتھوں اس قانون کو نظام بننا ہے۔ ھوالذی ایدک بنصرہ وبالمومنین (۸/۶۲)۔ خدا وہ ہے جس نے تمہاری قوت کا سامان بہم پہنچایا ہے دو چیزوں کے ذریعے۔ ایک اس کا ضابطہ قانون جس کی نصرت تمہیں حاصل ہے اور دوسرے مومنین کی جماعت۔ اس جماعت کی یہ حالت ہے کہ وحدت نصب العین سے ان میں کامل ہم آہنگی اور یک نگہی پیدا ہو چکی ہے۔ (والف بین قلوبکم) یہ وہ شے ہے جو دنیا میں روپے سے خریدی نہیں جا سکتی۔ تم روپے کے زور پر لوگوں کا تعاون حاصل کر سکتے ہو۔ ان کے جسموں کو ایک جگہ اکٹھا کر سکتے ہو۔ بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کر سکتے ہو، ان کے ووٹ بھی خرید سکتے ہو۔ لیکن ان کے دلوں میں ہم آہنگی روپے کے زور پر پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نصب العین کی وحدت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ (لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم)۔ اس کے بعد پھر اس حقیقت کو دہرا دیا کہ یاد رکھو، تمہارے لئے خدا کا قانون اور اسے نافذ العمل بنانے والی جماعت کافی ہے۔ (یا ایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین۔ ۸/۶۴)۔

یہ کچھ تو خود رسول اللہؐ سے کہا۔ اب رہے افرادِ مومنین۔ سو ہو سکتا تھا کہ پرانے تصورات کے مطابق جو قرنہا قرن سے دنیا میں متوارث و متواتر چلے آرہے تھے، وہ بھی یہ سمجھ بیٹھتے کہ یہ سارا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات سے وابستہ ہے۔ انھوں نے اس اجتماعی ہیئت کی تشکیل کی ہے انہی کے دم تک اس کا وجود ہے۔ اس لئے کہ ان کے بعد ان جیسی اور شخصیت کونسی ہو سکتی ہے جس سے یہ سلسلہ قائم رہے؟ ان کے دلوں سے اس خیال کو نکال دینے کے لئے قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کہدیا کہ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ وما محمد الا رسول (۳/۱۴۴)۔ محمدؐ بیش ازیں نیست کہ ایک پیغامبر ہیں۔ قد خلت من قبلہ الرسل۔ (۳/۱۴۴)۔ ان سے پہلے بھی ایسے بہت سے پیغامبر ہو چکے ہیں۔ اس نظام میں ان کی یہ حیثیت ہے۔ اس لئے افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم (۳/۱۴۴)۔ اگر یہ بھی (اپنی عمر طبعی تک پہنچکر) وفات پا جائیں یا کسی جنگ میں قتل کر دیئے

جائیں۔ تو کیا تم (اُن پرانے تصورات کے مطابق، جن میں بادشاہ کے قتل ہو جانے سے سارا نقشہ بگڑ جاتا تھا) پھر اسی پرانی روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ کیا تم اُس وقت یہ خیال کرو گے کہ جس شخصیت کے دم سے یہ نظام قائم تھا جب وہ ہی باقی نہ رہی تو اب یہ نظام کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اگر تم ایسا خیال کرو گے تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔ اب شخصیتوں کا دَور ختم ہو گیا۔ اب زمانہ نظام اور تصورات کا آ گیا ہے۔ نظام میں کسی ایک فرد کی اہمیت کچھ نہیں ہوتی۔ اہمیت ہوتی ہے اس قانون یا تصور کی جس کا مظہر وہ نظام ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس جماعت کی جس کے ہاتھوں وہ متشکل ہوتا ہے۔ قانون ہم نے ایسا دیدیا ہے جو قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہے گا۔ اور اسے نافذ العمل بنانے کے لئے ایک ملت وجود میں آ گئی ہے یہی ملت اس قانون کی وارث ہے۔ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا (۳۵/۳۲) پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا۔ یہ وہ جماعت ہے جسے کہیں "خیر امۃ" کہا گیا ہے اور کہیں "امۃ وسطیٰ"۔ جب تک یہ امت اس قانون کی عملی تنفیذ کرتی رہے گی یہ نظام قائم رہے گا۔ جس دن اسے چھوڑ دے گی، نظام ختم ہو جائے گا۔ جب یہ نظام قائم ہو گا تو دنیا کا کوئی اور نظام اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ یہ سب پر غالب رہے گا۔ اور اسی نظام کی بدولت یہ امت بھی تمام اقوامِ عالم میں سربلند (اعلون) رہے گی۔ اس لئے کہ اب قوموں کی پستی اور بلندی اس نظام کی نسبت سے ہو گی جسے وہ اختیار کریں گی۔ اگر کسی نظام میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت ہے تو جو قوم بھی اس نظام کو اختیار کرے گی زندہ اور پائندہ ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس نظام میں زندگی کی صلاحیتیں نہیں ہیں تو اُسی نافذ کرنے والی قوم بھی زندہ نہیں رہ سکے گی۔ اب قوموں کی زندگی اور موت کا یہی معیار ہے۔

قرآن نے یہ انقلاب آفریں تصور دیا جس میں انسانوں کی توجہات، اشخاص سے ہٹا کر نظام اور جماعت سے وابستہ کر دیں، یہ انسانی تاریخ میں بہت بڑا انقلاب تھا۔ لیکن مسلمانوں کا ذہن اس تصور کو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ سکا (حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے دیگر تصورات کی طرح اس تصور کو بھی شعوری بننے کے لئے ابھی ایک عرصہ درکار تھا۔ قرآن نے ان جدید تصورات کو دیدیا تھا تاکہ یہ انسانوں کی راہ نمائی کا کام دے سکیں۔ لیکن انسانی فکر نے اس مقام تک بتدریج پہنچنا تھا جہاں وہ ان تصورات کو اپنا سکے۔ تفصیل اس اجمال کی ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔ مسلمان اس تصور کو زیادہ دیر تک اپنے سامنے نہ رکھ سکے۔ اس نظام کی جگہ پھر بادشاہت نے لے لی اور امت کی نگاہیں پھر شخصیتوں کو تلاش کرنے لگ گئیں۔ قرآن نے نبوت کو اس لئے ختم کر دیا تھا تاکہ قوم کو کسی مزید شخصیت کا انتظار نہ رہے اور وہ سمجھ لیں کہ اب شخصیتوں کا دَور ختم ہو گیا۔ اب "نظام اور جماعت" ہی نے آگے چلنا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہیں پھر شخصیتوں کو تلاش کرنے لگیں تو جو قوتیں چاہتی تھیں کہ یہ قرآن کے تصور نظام و جماعت سے بیگانہ رہیں اور شخصیتوں میں الجھی رہیں، انھوں نے شخصیتوں کے تصور بہم پہنچا دیئے۔ مسیح موعود۔ مہدی آخر الزماں۔ سو سو سال کے بعد مجددین۔ یہ سب انہی کے تراشیدہ تصورات ہیں۔

مسلمان ہزار برس سے شخصیتوں کے الجھاؤ میں الجھا رہا لیکن اللہ کے کائناتی قانون کے مطابق، فکر انسانی آہستہ آہستہ پختگی حاصل کرتا چلا گیا۔ چنانچہ اب یہ فکر اس مقام تک پہنچ رہا ہے جہاں اس نے شعوری طور پر سمجھ لیا ہے کہ قوموں کی زندگی اشخاص سے وابستہ نہیں ہوتی بلکہ نظام کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ مغرب کی اقوام اب آہستہ آہستہ اصولی طور پر اس حقیقت کو اپنائے جارہی ہیں۔ اب ان کے ہاں اشخاص پر زور نہیں دیا جارہا بلکہ تصور (IDEOLOGY) پر زور دیا جاتا ہے۔ اب دنیا میں مقابلہ افراد کا نہیں بلکہ نظامہائے زندگی کا ہے۔ اب انسانی ذہن اس تصور کو شعوری طور پر قبول کر رہا ہے جسے قرآن نے اتنا عرصہ پہلے پیش کیا تھا۔ اب انسان، اس قرآنی تصور کو پس پشت نہیں ڈالے گا کیونکہ انسان جس چیز کو شعوری طور پر اختیار کرلے اور اس کے نتائج بھی اس کے سامنے آجائیں پھر اسے چھوڑا نہیں کرتا۔ انسانی فکر، ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں جاتا۔ اس لئے جب وہ کسی تصور کو شعوری طور پر قبول کرلیتا ہے، استنتاجی طور پر (PRAGMATICALLY) پرکھ لیتا ہے تو پھر اس سے رجعت اختیار نہیں کرتا۔

اقوام مغرب میں تو یہ ہو رہا ہے لیکن مسلمان ابھی تک شخصیتوں کے الجھاؤ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں ابھی تک ملوکیت بھی ہے اور پیشوائیت (ملائیت) بھی۔ انھیں امام مہدی کا بھی انتظار ہے اور آنے والے مسیح کا بھی۔ یہ اسلئے کہ قرآنی تصور کے قبول کرنے کی دو ہی شکلیں تھیں۔ یا ایمان بالغیب (جس کی رو سے قرنِ اول کے مسلمانوں نے اسے قبول کیا)۔ اور یا فکرِ انسانی کی ترقی سے، شعوری طور پر (جیسے مغربی اقوام، بغیر نام لئے ان تصورات کے قریب آرہی ہیں)۔ مسلمان کے دل میں قرآنی نظام کے متعلق وہ ایمان بالغیب تو رہا نہیں جس کی بنا پر اسے قرنِ اول میں اختیار کیا گیا تھا۔ باقی رہی دوسری شکل۔ سو صدیوں کی تقلید اور اسلاف پرستی نے ان کے فکری ارتقا کو مفلوج کر رکھا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ مسلمان اب، قرآنی تصورات کے قریب آنے میں، غیر مسلموں سے بھی پیچھے رہ چکا ہے۔ اس کی نگاہیں ابھی تک شخصیتوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ ماضی کی شخصیتیں جن کی وجہ سے یہ آجتک اس قابل نہیں ہو سکا کہ اپنی تاریخ کا آزادانہ مطالعہ کر کے صحیح صحیح نتائج تک پہنچ سکے۔ اور حال کی شخصیتیں جو ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مستبد شخصیت اسے اپنے پنجۂ آہنی میں جکڑ لیتی ہے تو اسے اس سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی، اور اس پر یکسر مایوسی چھا جاتی ہے اور جب اتفاق سے اس کی جگہ کوئی اور شخصیت آجاتی ہے تو یہ اس تبدیلی پر جشن مناتا ہے۔ حالانکہ اصل شے وہ نظام ہے جسے چلانے کے لئے یہ افراد آتے ہیں۔ اگر وہ نظام غلط ہے تو ان افراد کی ہزار پر خلوص کوششیں بھی اس سے صحیح نتائج مرتب نہیں کرا سکتیں۔ جس برتن میں دہی کی آمیزش ہو، اس میں جتنا جی چاہے خالص دودھ ڈالتے جائیے سب پھٹ جائے گا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ کسی قابل سے قابل مالی کی چابکدستی اور ہنرمندی، محنت اور جفاکشی، تھوہر کے درخت سے انگور نہیں پیدا کر سکتی۔

لہٰذا ہم محترم غلام محمد صاحب کی خدمت میں، ان کے اس اقدام پر ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے بعد گذارش کریں گے کہ جب تک ہمارا موجودہ غیر قرآنی نظام نہیں بدلتا، ان کی ہزار مقدس آرزوئیں اور ان کے رفقائے کار کی پرخلوص کوششیں کبھی وہ نتائج برآمد نہیں کرسکتیں جنہیں دیکھنے کے لئے انہوں نے ایسا عزیمانہ قدم اٹھایا ہے۔ اس باب میں قرآن کا فیصلہ بالکل واضح ہے۔ جب اس نے کہا کہ لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب (۴/۱۲۳)۔ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق وہ نتیجہ نکل سکتا ہے جو تم چاہتے ہو اور نہ ہی تمہارے فریقِ مخالف کی آرزوؤں کے مطابق۔ نتیجہ نکلے گا ہمارے قانون کے مطابق۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو پروگرام ناہمواریوں پر مشتمل ہوگا اس کا نتیجہ ناہمواریاں ہی ہوں گی۔ (من یعمل سوءً یجز بہ) جو چاہتا ہے کہ اس کے معاشرہ میں ایسی ناہمواریاں نہ رہیں تو اسے خدا کا قانون اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے علاوہ ان ناہمواریوں کا علاج اور کہیں نہیں (ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا)۔ جنت کا نقشہ تو صرف وہ پروگرام پیدا کرسکتا ہے جس میں معاشرے کے تمام افراد، مرد اور عورت، صلاحیت بخش کاموں میں لگ جائیں (ومن یعمل من الصلحت من ذکر او انثی وھو مؤمن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا۔ ۴/۱۲۴)۔ اور یہ چیز اس نظام کی رو سے پیدا ہوسکتی ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے اور جس سے نوعِ انسانی میں حسن کارانہ انداز سے توازن قائم ہوجاتا ہے (ومن احسن دینا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن۔ ۴/۱۲۵)۔

یہ چیز کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اس کے لئے بھی اسی قسم کی "عشق کی ایک جست" کی ضرورت ہے، جس جست سے آپ نے ابھی ابھی سب "قصے تمام" کردیئے ہیں۔ اس وقت تک قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ ہماری مجلس قانون ساز نے کیا ہے غلط راستوں پر کیا ہے۔ ان تمام کوششوں میں (خواہ وہ قرارداد مقاصد کے سلسلے میں ہوئیں یا بنیادی کمیٹی کی رپورٹ کے سلسلے میں) اربابِ متعلقہ کے فیصلوں پر (شعوری یا غیر شعوری طور پر) یہ جذبہ اثر انداز رہا کہ کسی نہ کسی طرح ملک کے مذہب پرست (مُلّا کے) طبقہ کی خوشنودی حاصل کرلی جائے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ، قرآنی آئین تو خیر بہت دور کی چیز ہے جو کچھ دوسری قومیں تنہا فکرِ انسانی کی مدد سے مرتب کرلیتی ہیں۔ ہمارے ہاں اتنا بھی نہیں ہوسکا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت تک اس جذبے کے ماتحت ہوا ہے اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے، ملک سے ایسے اربابِ فکر و نظر کو اکٹھا کرلیا جائے جو یہ بتا سکیں کہ دورِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قرآن کون کون سے اصول دیتا ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں فکرِ انسانی کے مطابق اپنا آئین مرتب کرلیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک ایسا نظام قائم ہوجائے گا جس کی تلاش میں اس وقت انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔

اسی نظام سے پاکستان کو اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ آپ اگر یہ کام کر گئے تو جریدۂ عالم پر آپ کا دوام ثبت ہو جائے گا۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

(۲)

وہ جو کہتے ہیں کہ

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

اس کا ایک تازہ ثبوت کوائف پنجاب سے ملتا ہے۔ لاہور میں پچھلے دنوں جو تاسف انگیز حوادث رونما ہوئے ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں۔ صورت حالات یہانتک نازک ہوگئی کہ لاہور کا نظم ونسق فوج کے سپرد کر دینا پڑا۔ چونکہ یہ چیز شہری آبادی کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا اس لئے کچھ تو مارشل لاء کے تصور سے اور کچھ پروپیگنڈے کے اثر سے لوگ اس تبدیلی سے ہراسانی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ یہ تبدیلی لوگوں کے حق میں آیۂ رحمت تھی۔ ہم خود تو لاہور نہیں گئے لیکن وہاں سے آمدہ اطلاعات مظہر ہیں کہ فوجی نظم ونسق نے چند ہی روز میں لاہور کی کایا پلٹ دی ہے قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صائب الرائے، معتدل مزاج صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ

> مارشل لاء مسلمانوں کے لئے خدا کی رحمت ہے۔ لاہور میں آجکل چوری چکاری نہیں، غنڈہ گردی نہیں، چور بازاری نہیں، رشوت لیتے اب لوگ ڈرنے لگے ہیں، ہر دوکاندار بھاؤ اور تول میں بیحد محتاط ہے۔ میونسپل کمیٹی کے اسٹاف میں کوئی اضافہ نہیں ہوا مگر شہر میں صفائی ایسی کبھی انگریز کے وقت میں بھی نہ تھی۔ ہر دکاندار اور مکاندار اپنے گرد وپیش کی صفائی کا خود ذمہ دار ہے۔ تانگہ والا اب آپ سے جھگڑا نہیں کرے گا۔ ایمانداری اب سنبھلنے لگی ہے۔ (وغیرہ وغیرہ)۔

جو قومیں اپنے اندر زندگی کی صلاحیتیں پیدا کر کے آزادی حاصل کرتی ہیں، ان میں آئین وضوابط کی پابندی اور عام معاشرتی اقدار کا احساس ازخود پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں "بائیں کی طرف" چلانے کے لئے کسی سپاہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو قومیں ان صلاحیتوں کے بغیر آزاد ہو جاتی ہیں ان کے نزدیک آزادی سے مفہوم ہوتا ہے "مادر پدر آزادی" بدقسمتی سے ہمارا شمار اس آخری طبقہ ہی میں ہے۔ چنانچہ یہاں آزادی ملنے پر حاکم اور محکوم۔ رعایا اور افسر سب یہ سمجھنے لگ گئے کہ اب نہ کسی آئین کی ضرورت ہے نہ قانون کی، نہ کسی قاعدہ کی پابندی لازم ہے نہ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی۔ یہ بے راہ روی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ حساس طبائع پر یکسر مایوسی چھا رہی تھی کہ بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بارے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا

کہ ہمارا فوجی عنصر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ معاشرہ کو ان خطوط پر چلا سکے جنہیں صحیح معنوں میں آزاد قومیں از خود قائم رکھا کرتی ہیں۔

لیکن اس قسم کا انتظام صرف ہنگامی طور پر قائم کیا جا سکتا ہے مستقل طور پر نہیں۔ مستقل طور پر وہی انتظام کامیاب ثابت ہوتا ہے جس میں آئین وضوابط کی پابندی دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہماری تعلیم گاہوں میں بچوں اور نوجوانوں کی تربیت اور تعلیم صحیح طریق پر شروع ہو جائے۔ جب اس قسم کے بچے زندگی کے میدان میں آئیں گے تو ان میں ایک آزاد قوم بننے کی صلاحیتیں پیدا ہوں گی۔ اگر ہم نے ایسا انتظام نہ کیا تو جوں ہی فوجی نظم ونسق کی "جباریت"[1] اٹھ جائے گی معاشرہ میں پہلے سے بھی زیادہ بدعنوانیاں ابھر آئیں گی۔ خدا کرے کہ مرکز کی تبدیل شدہ حکومت اس مسئلہ کی طرف جلد از جلد اپنی توجہات مرکوز کرے۔

(۳)

تشکیل پاکستان کے بعد طلوع اسلام نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ پاکستان میں علامہ اقبال کے پیغام کو عام کیا جائے کیونکہ اقبال کا پیغام دور حاضرہ کی علمی سطح کے مطابق قرآن کی تعبیر پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں طلوع اسلام کی تحریک پر حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا کہ "نظریۂ پاکستان کیلئے اقبال کے بے مثل عطایا کی یاد میں اس دن تمام دفاتر بند رہیں"۔ اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں حکومت کی طرف سے اقبال اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۵۰ء میں خود گورنر جنرل ہاؤس میں یوم اقبال منایا گیا اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے وزیر صنعت (چوہدری نذیر احمد صاحب) کی زیر صدارت مجلس اقبال کی طرف سے بڑا کامیاب جلسہ ہوا۔ اسی کا اعادہ ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ لیکن اس کے بعد (ہر جذباتی قوم کی طرح) اس گرم جوشی میں افسردگی آنی شروع ہو گئی۔ یوم اقبال کی تعطیل تو دوسرے ہی سال ختم ہو گئی تھی۔ اب گورنر جنرل ہاؤس کا یوم اقبال بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء آیا تو مجلس اقبال کا چراغ بھی ٹمٹمانے لگا۔ چنانچہ ہماری اطلاع کے مطابق ۱۵ اپریل تک کسی کو اس کا خیال تک بھی نہ تھا کہ کراچی میں اس تقریب پر کوئی جلسہ بھی منعقد ہو سکے گا۔ اس کے بعد افراتفری میں اس تقریب کی اشک شوئی سی کر دی گئی۔ ہمیں اس صورت حالات پر کوئی افسوس یا رنج نہیں اسلئے کہ ہمیں اس قسم کی سوسائٹیوں سے کچھ زیادہ توقعات ہی نہیں ہوتیں اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ قرآن کا بنیادی اصول، احترام آدمیت ہے اور یہی پیغام اقبال کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یہ بالکل ایک نئی قدر ہے جو قرآن نے انسانیت کو دی اور جس کا چرچا اقبال نے کیا، ورنہ دنیا انسان کی قدر وقیمت اس کے ذاتی جوہروں کی بنا پر نہیں کرتی، ان اضافی نسبتوں سے کرتی ہے جو اس نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو مجالس اقبال کے نام پر قائم ہوں کم از کم ان میں تو اس بنیادی قدر کا لحاظ رکھا جائے لیکن ہماری مجالس اقبال کی نگاہیں بھی ہمیشہ

[1] جباریت خدا کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی پر اوپر اور نیچے رکھ کر باندھ دیا جائے تاکہ وہ جڑ جائے۔

اضافی نسبتوں کی طرف رہتی ہیں۔ ان کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ بزم کا سرپرست کوئی وزیراعظم ہو اور اس کا پریذیڈنٹ کوئی منسٹر۔ اور اس کا سکریٹری حکومت کا کوئی بہت بڑا افسر یا شہر کا بہت بڑا تاجر (خواہ انھیں نہ اقبال کے پیغام سے کوئی تعلق ہو اور نہ اس کی نشر و اشاعت سے کوئی غرض) اس کی ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کی شرائط موٹریں، اور کوٹھیاں ہوں۔ اور اس کی نشست گاہ کوئی میٹروپول ہوٹل۔ ظاہر ہے کہ جن مجالس کی عمارت ان اوچھی بنیادوں پر اٹھے وہ اقبال کے پیغام کو عام کرنے میں کیا نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ صحیح کام وہی بزم اقبال کر سکے گی جو تمام اضافی نسبتوں سے بلند ہو کر "آدمیت احترام آدمی" کے اصول پر تشکل ہوگی اور جس کی رکنیت کی شرائط اقبال کے پیغام سے محبت، اس کی تعلیم کی سمجھ بوجھ اور اس کے نور بصیرت کو عام کرنے کا ولولہ ہوں گی۔ اقبال شاعر فردا ہے اس لئے اس قسم کی بزم کی تشکیل بھی منتظر فردا ہے۔

محترم علامہ تمنا عمادی کی کتاب "اعجاز القرآن" پچھلے شمارہ سے طلوع اسلام میں شائع ہو رہی ہے جس کی پہلی قسط آپ اپریل کے پرچہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس پرچہ میں اس کی دوسری قسط آرہی ہے۔ یہ کتاب اسی طرح ہر ماہ مسلسل شائع ہوتی رہے گی۔ امید ہے کہ ناظرین طلوع اسلام اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے اور محترم تمنا عمادی صاحب کی اس کتاب سے کافی مستفید ہوں گے۔

رابطہ باہمی

جنوری ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مختلف شہروں کے قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے تعارف اور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف مقامات سے جن حضرات نے اس کیلئے اپنے نام پیش کئے وہ گذشتہ اشاعتوں میں شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اکثر اہم مقامات پر قارئین طلوع اسلام آپس میں ایک دوسرے سے برابر متعارف ہوتے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا قدم

یہ ہے کہ جن جن مقامات پر قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے اور رابطہ باہمی قائم کر چکے ہیں وہ اپنے اپنے مقام پر "بزم طلوع اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیں اور تمام قارئین کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اپنے میں سے کسی ایک معتمد علیہ شخص کو اپنی بزم کا "ترجمان" منتخب کر لیں۔ بزم طلوع اسلام قائم ہو جانے اور ترجمان کا انتخاب ہو جانے کے بعد یہ ترجمان اپنے مقام کی بزم کے متعلق ادارہ طلوع اسلام کو اپنی رپورٹ بھیجے اور آئندہ سے یہ ترجمان ادارہ طلوع اسلام سے براہ راست رابطہ قائم رکھے۔

قارئین طلوع اسلام کراچی اسی تجویز کے مطابق بزم طلوع اسلام قائم کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں باقی ہدایات ہر مقام کے ترجمان کو ادارہ سے بھیجی جاتی رہیں گی۔ والسلام

ناظم: ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

نوٹ: مانسہرہ ضلع ہزارہ کے حضرات

جناب غلام مصطفےٰ صاحب ٹائر بی۔ اے۔ مانسہرہ ضلع ہزارہ سے رابطہ پیدا کریں۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ

جو قرآنی فکر اور نظامِ ربوبیت کی آواز

طلوعِ اسلام کے ذریعے پھیل رہی ہے۔

(خدانکردہ) اس کا سلسلہ رُک جائے؟

اگر آپ یہ نہیں چاہتے

تو دوسرے صفحہ پر درج شدہ اسکیم کو غور سے

پڑھئے اور اس میں شامل ہو جائیے۔

اسکیم معاونینِ طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام جس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے ا[illegible] جس [illegible]م ربوبیت کا نقیب، اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسوقت تمام عالمِ اسلامی میں یہ آواز کہیں اور سے نہیں اُٹھ رہی۔ ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ مسلمانوں کو پھر اُس نظام سے روشناس کرایا جارہا ہے جسے قرآن نے پیش کیا اور محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا۔

طلوعِ اسلام کی یہ آواز بالکل محدود ہے اور زمانے کا تقاضا ہے کہ اسے دُور دُور تک پھیلا دیا جائے، نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں نہیں! بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی۔

یہ کام آپ کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس معاونت کی شکل یہ ہے کہ آپ

معاونینِ طلوعِ اسلام کے حلقے میں

شامل ہو جائیں۔ اس کے لئے آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں) ادا فرمادیں اس کے بدلے میں دو سال تک رسالہ طلوعِ اسلام اور اس دو سال میں جتنی کتابیں ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع ہوں

آپ کو بلا قیمت ملتی رہیں گی

آپ خود بھی اس حلقے میں شامل ہو جائیے اور اپنے احباب کو بھی شامل ہونے پر آمادہ کیجئے۔ آپ کی اس معاونت سے یہ آواز دور دور تک پھیل جائے گی۔ کیا عجب کہ آپ کی یہ رفاقت اس قرآنی انقلاب کو قریب تر لے آئے جس کے لئے انسانیت اس طرح تڑپ رہی ہے۔

صرف ایک سو روپیہ۔ بذریعہ منی آرڈر یا بذریعہ چیک بنام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام، کراچی

ارسال فرما دیجئے۔ اور اپنا پورا پتہ بھی لکھدیجئے۔ اس رقم کی رسید آپ کو الگ بھیجدی جائیگی۔

طلوع اسلام کی اس اسکیم کو کامیاب بنائیے ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ آواز آگے بڑھنے سے رُک جائے۔ اِسوقت دنیا کو قرآن کے قریب لانے کے لئے حالات بڑے امید افزا ہیں۔ دنیا خود اس کی تلاش میں ہے۔ اس کوشش میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ اس لئے کہ یہ ہمارا اور آپ کا مشترکہ مقصد ہے۔

ہمارے پاس قرآنی نظامِ ربوبیت سے متعلق بہت سا لٹریچر تیار رکھا ہے، لیکن وہ آپ کی معاونت کے بغیر شائع نہیں ہوسکتا۔ ہم اپنے مقدور کے مطابق کوشش کر رہے ہیں۔ آپ اپنے مقدور کے مطابق ہمارا ساتھ دیجئے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
کراچی

سلیم کے نام...

لیجئے۔ بالآخر وہ کتاب بھی تیار ہوگئی جس کا آپ کو برسوں سے انتظار تھا یعنی "سلیم کے نام" خطوط کا مجموعہ۔ اس میں ۱۹۳۹ء سے اِسوقت تک کے خطوط شامل ہیں۔ وہ بھی جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں (ان پر نظر ثانی کی گئی ہے) اور کچھ ایسے خطوط بھی جو ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ اکیس خطوط کا مرقع اور اس کے ساتھ خود جناب پرویز کا لکھا ہوا تعارف۔

ہمارا دعوےٰ ہے کہ یہ کتاب کسی نوجوان کو دیدیجئے، اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل جائے گا۔ اس کے قلب و دماغ کی تعمیر نئے خطوط پر ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے سامنے اُس اسلام کی اصلی تصویر آجائے گی جو آجتک اس کے لئے ہوّا بنا ہوا تھا۔

یہ کتاب کمیونسٹ کو دیجئے ——— وہ قرآنی نظامِ ربوبیت کا گرویدہ ہو جائے گا۔

ملحد کو دیجئے ——— اس کی نگاہیں خدا کے حضور جھک جائیں گی۔

اسلام سے بیزار، ملا گزیدہ کو دیجئے ——— وہ والہانہ، اسلام کا پرستار بن جائے گا۔

یہ کتاب (۱۷×۲۷ کے) بڑے سائز کے، قریب سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت ہو چکی ہے۔ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کی وجہ سے، اس کا پہلا ایڈیشن اتنا ہی چھاپا جائیگا جتنی اس کی مانگ ہوگی۔ آپ اپنا آرڈر فوراً بھیجدیجئے۔ (قیمت کا اندازہ کاغذ ملنے پر کیا جا سکے گا۔)

آپ کم از کم اتنا کیجئے کہ اگر ایک جلد اپنے لئے لیجئے تو ایک جلد کالج کے کسی مستحق طالب علم تک بھی پہنچا دیجئے۔ اس سے دیکھئے کہ کتنے عمدہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

معراجِ نبوی صلعم کے دو رُخ

(۱)

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو انھوں نے ۷؍جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈکاسٹ کی تھی۔ طلوع اسلام]

کائنات میں جب سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے، زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل اس کے لئے ہمیشہ وجۂ کاوش و اضطراب رہے ہیں۔ انسان کیا ہے؟ جوئے زندگی کا سرچشمہ کونسا ہے؟ اس کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ کاروانِ حیات کی منزل کونسی ہے؟ مرنے کے بعد انسان پر کیا گذرتی ہے؟ یہ اور اسی قسم کے اور سوالات ذہنِ انسانی میں پیدا ہوتے رہے اور علمِ انسانی ان کے اطمینان بخش حل کی تلاش میں ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنا رہا۔ فکرِ انسانی کی پوری تاریخ انہی سوالات کے حل کی تلاش کی مسلسل داستان ہے۔ اور یونان کی حکمت گاہیں اور ایران کے آتشکدے، ہندوستان کی غاریں اور شام کی خانقاہیں سب اسی داستان کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ فکرِ انسانی نے اس باب میں بڑی کدو کاوش سے کام لیا ہے لیکن جہاں وہ ایک طرف ان مسائل کی گہرائیوں اور بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا ہے، ایک جویائے حقیقت کے لئے یہ امر بھی کچھ کم باعثِ حیرت نہیں کہ وہ دوسری طرف اس سطحیت پر آکر رک بھی گیا ہے کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب　　موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ مادی نظریۂ زندگی، یہ میکانکی تصورِ حیات، یہ دعویٰ کہ اندھی فطرت کے ایک ہنگامی عمل سے انسان میں زندگی نمودار ہوگئی اور اس کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ فکرِ انسانی کی تجسس و کاوش کا ماحصل نہیں بلکہ ادراکِ حقیقت میں اس کے عجز و درماندگی کا اعتراف ہے، یہ منزل پر پہنچے ہوئے مسافر کا سکون نہیں بلکہ تھک کر راستے میں بیٹھ جانے والے درماندہ راہرو کی صدائے دردناک ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم نہیں بلکہ اس سے گریز و فرار کا پُرفریب گوشۂ عافیت ہے۔ اس نظریہ کی ابتدا یونان کی ابیقوریت سے ہوئی لیکن یہ اپنے شباب پر یورپ کی عشرت گاہوں میں بیسویں صدی میں آکر پہنچا۔ لیکن یہ نظریہ اس قدر علم حقیقت کے خلاف اور سطحیت کی کمزور بنیادوں پر استوار تھا کہ ابھی اپنی جوانی کی چند بہاریں بھی دیکھنے نہ پایا تھا کہ خود یورپ کے مفکرین کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوگیا اور انہی تجربہ گاہوں . . . سے جن میں اس نے نشوونما پائی تھی، ایڈنگٹن کے الفاظ میں یہ آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں کہ

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان خالص طبعی عناصر سے ایک مختلف اور جداگانہ شے ہے۔

قطع نظر اس کے کہ یہ نظریہ کس طرح علم و حقیقت کے خلاف ثابت ہوا، یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اس نے اس کائنات میں انسان کے مرتبۂ بلند کو کس طرح ذلت کی پستیوں میں گرا دیا۔ اس سے انسان ایک مشین بن کر رہ گیا یا زیادہ سے زیادہ حیوان۔ زندگی نام رہ گیا ارتباطِ جسم و جان کے لئے روٹی کا، اور انسانی جدوجہد کا ماحصل، اس روٹی کا حصول۔ نہ انسان کے لئے کوئی نصب العین رہا نہ زندگی کے لئے کوئی درخشندہ اقدار، زندگی بلا مقصد، مستقبل تاریک۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ تصادم و تزاحم تھا جس نے یورپ اور اس کے ساتھ ساری دنیا کو اس طرح جہنم زار بنا رکھا ہے۔ ڈاکٹر میسن کے الفاظ میں:۔

> ہمارے دور میں خوشحالی اس قدر فراواں ہے کہ بایدو شاید، عیش و عشرت کے سامان ہر جگہ موجود ہیں، مادی کامیابی کے مواقع نچلے سے نچلے درجے کے انسانوں تک کو میسر ہیں۔ لیکن انسان بیحد مضطرب و بیقرار ہے۔ تخلیق کی قوتِ محرکہ کبھی مستقل طور پر ایسے نظریہ کو سینے سے لگائے نہیں رکھ سکتی جو انسانی ذات کو محض مادے کی نمود قرار دے، ایسے نظریہ کے ماتحت افراد اور قومیں دونوں تباہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔

یہ تھا مادی نظریۂ حیات۔

حکمت یونان کے ایک اور گوشے نے جس میں فیثا غورث کا نام ممتاز حیثیت رکھتا ہے، تسلسلِ حیات کا اعتراف تو کیا لیکن اس نے زندگی کو اس آب و گل کی دنیا میں چکر دینے شروع کر دیئے جس سے اس کا تسلسل دوری حرکت میں تبدیل ہو کر بے نتیجہ بن کر رہ گیا اور افقِ زندگی پر مایوسی کی ظلمتناک گھٹائیں چھا گئیں۔

لیکن قرآن نے انسان کو ایک نیا تصورِ حیات دیا جس نے دنیائے فکر و عمل میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے کہا کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے اور موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس سے ہوتا صرف اس قدر ہے کہ یہ ندی، پہاڑ کی اوٹ میں جا کر تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ کاروانِ حیات ایک شاہراہِ عظیم یعنی صراطِ مستقیم پر ایک حسین و جمیل منزل کی طرف بڑھے جا رہا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر خالقِ کائنات کا قانونِ مشیت ساری کائنات کو رواں دواں اور کشاں کشاں لئے جا رہا ہے اور خالقِ کائنات، رب ذی المعارج یعنی بلندیوں کا خدا ہے اسلئے یہ صراطِ مستقیم نہ صرف سیدھی راہ ہے بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے۔ لہٰذا زندگی کی حرکت دوری نہیں بلکہ عمودی اور ارتقائی ہے۔ بلند سے بلند تر مقامات تک لے جانے والی۔ خاک کے ذرے، اپنی ارتقائی منزل طے کر کے انسانی پیکر میں متشکل ہو گئے۔ اب اس کے بعد یہ ارتقاء، طبیعی ارتقاء (Physical Evolution) نہیں بلکہ شرفِ انسانیت کا ارتقاء ہو گا۔ اس عروج و ارتقاء سے انسان، قرآن کے الفاظ میں اقطارِ السمٰوٰت والارض یعنی اس طبیعی کائنات (Physical Universe) کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے۔ وہ قوت جس سے انسان، شرفِ انسانیت کی ان تحیر انگیز بلندیوں تک جا پہنچتا ہے، ضمیر کائنات یعنی قوانین خداوندی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا نام اطاعتِ خداوندی ہے جو درحقیقت قوتِ وحیات کے اس سرچشمۂ حقیقی سے رفاقت کا نام ہے اسی اطاعت و رفاقت کو اسلام کہتے ہیں اور اس کی مکمل تفسیر، مقامِ محمدی میں ملتی ہے۔ اس لئے مقامِ محمدی شرفِ انسانیت کے نقطۂ کمال کا ترجمان ہے اور اسی کا نام انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ پیامِ محمدی نے [جو وحی کے ذریعے صرف رسول ہی کو مل سکتا تھا] انسان کو

اس کے حقیقی مقام سے آشنا کرادیا اور اسے بتادیا کہ مادی دنیا، ارتقائے انسانیت کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی تسخیر اور صحیح مقصد میں اس کا صرف، اس ارتقاء کے لئے ممد و معاون ہوتا ہے۔ درخت کی جڑیں اسلئے خاک میں پیوست ہوتی ہیں کہ اس کی شاخیں آسمان کو چھولیں۔ اس تسخیر مادہ سے، خود مادہ کے اندر روح کی نمود ہوجاتی ہے اور اس طرح انسان اپنی ارتقائی منازل طے کرتا اقطار السموات والارض یعنی کائنات کی چاردیواری سے بلند ہوتا جاتا ہے یہی معراج انسانیت ہے جس کے فقدان سے آج انسان بایں ہمہ ادعائے علم و تحقیق، جہالت اور سبعیت کی پستیوں میں گرتا جارہا ہے اور جس کی تصویر میسن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"ہمارے دور میں جس چیز کی کمی ہے وہ انسانی خودی ہے جس کی نمود مادہ اور روح دونوں میں ہونی چاہئے۔ انسان مادی کامرانیوں میں ڈوبا ہوا پریشان اور ایک عجیب الجھاؤ میں ہے اسلئے کہ اس کی ذات اپنے آپ کو مادہ سے بلند نہیں لے جاسکتی بلکہ مادہ کے اندر ڈوبی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ اس کا اضطراب اسلئے ہے کہ اس کا تحت الشعور یہ چاہتا ہے کہ وہ ثابت کردے کہ وہ مادہ سے جن چیزوں کی تخلیق کرتا ہے خود ان سے کچھ بیش ہے۔ وہ مادی کاریگری کو بحال رکھنا چاہتا ہے اسلئے کہ اس کی قوتِ تخلیق کی مدد کیلئے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو مادیت سے بلند لے جائے اور اس کی ذات کا اندازہ اس کی مادی تخلیق سے لگایا جائے بلکہ اس سے کہ وہ خود کیا ہے۔"

سلام ہو اس ذاتِ اقدس و اعظم پر جس نے انسان کو بتایا کہ وہ مادی کاریگری کو بحال رکھتے ہوئے کس طرح اپنے آپ کو مادہ کی چاردیواری سے بلند لے جاسکتا ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ خود معراج انسانیت کے اس افق اعلیٰ پر متمکن ہوکر دکھادیا کہ ان بلند مقامات تک پہنچنے کی راہ کونسی ہے۔ اگر مسلمان دنیا میں معراج محمدی کی یاد قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ یہ اپنے آپ کو ایک ایسی ملت ثابت کرے جس کے سامنے زندگی کا بلند نصب العین ہو اور دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ جس کی نگاہ پاک ہو اور حوصلہ بیباک، سینہ کشادہ ہو اور ہمت بلند۔ جو کائنات کی قوتوں کو مسخر کرکے انھیں تعمیرِ انسانیت کے پاکیزہ مقصد میں صرف کرے اور اس طرح خود بھی خار و خسِ چمن ہونے کی بجائے شاخِ نہالِ سدرہ بن جائے اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو اس جہانِ آب و گل کی پستیوں سے نکال کر فلک الافلاک کی بلندیوں تک لیجائے۔

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

(۲)

[سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ریڈیو کی تقریر جو ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔]

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپ کی

سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبرئیلؑ نے تھپکی دیکر کہا، دیکھ کیا کرتا ہے آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپ اس پر سوار ہوئے اور جبرئیلؑ آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبرئیلؑ نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طور سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰؑ سے ہمکلام ہوا۔ تیسری منزل بیتِ لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا اِدھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ کی۔ جبرئیلؑ نے بتایا یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا دوسری طرف سے آواز آئی اِدھر آؤ، آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبرئیلؑ نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت بنی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبرئیلؑ نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبرئیلؑ نے کہا دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجئے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبرئیلؑ نے کہا یہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچکر آپ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اُسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اسکو باندھا کرتے تھے۔ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اسوقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کیلئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبرئیلؑ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے ایک میں پانی، دوسرے میں دودھ، تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبرئیلؑ نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبرئیلؑ اس کے ذریعے سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے؟ جبرئیلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا محمدؐ۔ پوچھا کیا انھیں بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں۔ تب دروازہ کھلا اور آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی اُن بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبرئیلؑ نے بتایا یہ آدم ہیں، آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسلِ آدم ہے۔ آدمؑ اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھکر خوش ہوتے ہیں اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی

چلی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انھیں نماز کیلئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر یہ دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گذرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کہ کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیئے جو اُن کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترشروئی سے ملا۔ آپؐ نے جبرئیلؑ سے پوچھا

اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے۔ ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا اسکے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سُنکر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہوگئی۔

اس مرحلہ سے گذر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰؑ اور عیسیٰؑ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حُسن عام انسانوں کے مقابلہ میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے تعارف پر معلوم ہوا حضرت ابراہیمؑ ہیں۔

پھر مزیدار تقاء شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور فرامین براہ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گذر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہِ جلال سامنے تھی ہمکلامی کا شرف بخشا گیا جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشیٔ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی انھوں نے روداد سن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں، میرا اندازہ ہے کہ آپ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی جائیے اور کمی کیلئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ ان کے کہنے پر آپ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں۔ آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے۔ آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی

نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچازاد بہن ام ہانی کو یہ روداد سنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انھوں نے آپ کی چادر پکڑ لی اور کہا خدا کے لئے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنائیے گا ورنہ ان کو آپ کا مذاق اڑانے کے لئے ایک اور شوشہ ہاتھ آجائے گا مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا۔ حرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ کہا بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے؟ اور صبح یہاں موجود ہو؟ فرمایا ہاں۔ کہا قوم کو جمع کروں؟ سب کے سامنے یہی بات کہو گے؟ فرمایا بیشک۔ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کر لیا اور کہا لو اب کہو۔ آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ دو مہینے کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن! محال! پہلے تو شک تھا، اب یقین ہو گیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے کہ یہ محمدؐ کے دست راست ہیں، یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے۔ انھوں نے یہ قصہ سن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ حرم کعبہ میں آئے۔ رسول اللہؐ موجود تھے اور ہنسی اڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا ہاں۔ کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے، آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔ وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے۔ وہ سب دلوں میں قائل ہو گئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ فرمایا جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گذرا جس کے ساتھ یہ سامان تھا، قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے۔ ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا۔ سب سو رہے تھے، میں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ اور اتے پتے آپ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟۔

کیا اسلام میں
نظامِ جاگیرداری و زمینداری
کی
گنجائش ہے

(سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

[سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا زیر نظر مقالہ مجلہ معارف (اعظم گڈھ) کی دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء کے پرچوں میں شائع ہوا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ طلوع اسلام نے دوسرے پرچوں میں شائع شدہ مضامین اپنے ہاں شائع کئے ہوں۔ لیکن اس مسلک کے خلاف اس مضمون کو طلوع اسلام میں اسلئے شائع کیا جاتا ہے کہ اس میں زمینداری کے اہم سوال پر احادیث کی رُو سے بحث کی گئی ہے۔ زمینداری کے متعلق طلوع اسلام کا جو مسلک ہے وہ قارئین طلوع اسلام کے سامنے بار بار آچکا ہے۔ ابھی طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں اس موضوع پر ایک مبسوط مضمون شائع ہو چکا ہے۔ امید ہے قارئین طلوع اسلام زیر نظر مضمون سے بھی استفادہ حاصل کرینگے جسے ہم مجلۂ معارف کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ شروع سے چند تمہیدی سطور حذف کر دی گئی ہیں۔ (طلوع اسلام)]

واقعہ یہ ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ عالمگیر نبوت کبریٰ کا عہد، انسانی تاریخ کا وہ خاص عہد اور زمانہ تھا جس میں پرشین امپائر (ایرانی شہنشاہیت) اور رومن امپائر (رومی شاہنشاہیت) مشرق و مغرب کی یہ دونوں جبار و قاہرہ حکومتیں روئے زمین کی تسخیر و دارائی کیلئے باہم دست و گریباں تھیں، دونوں میں کشمکش کا طویل تاریخی سلسلہ تھا، جو صدیوں سے جاری تھا۔

عالمگیر کش مکش کے ان ہی دنوں میں اچانک اسلام کا پیغام مشرق و مغرب کی ان دونوں حریف قوتوں کے درمیان سرزمین حجاز سے بلند ہوا اور چند سال بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ دونوں ہی کو چت کر کے کرۂ زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کا قالب اسلام نے اختیار کر لیا۔

یہ ایک واقعہ ہے جو تاریخ کے روشن دنوں میں گذرا ہے، دوست و دشمن سب ہی کا جانا پہچانا واقعہ ہے لیکن یہ سوال کہ ان دونوں جہان پامال، استکباری قوتوں سے اسلام نے جو ٹکر لی، پنجہ آزمائی کی، اس مہم کی غرض و غایت کیا تھی۔ یعنی ایرانی اور رومیوں کے مقابلہ میں اسلام کی جہادی و جنگی جدوجہد کا سب سے بڑا نصب العین کیا تھا۔

اسلامی وثائق اور عہد نبوت و خلافت کی تاریخ کے عمیق اور گہرے مطالعہ کے بعد حکیم الہند سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح نے آج سے دو سو سال پہلے اپنی کتاب ازالۃ الخفا میں اسی سوال کا جو جواب دیا ہے، انہی کے الفاظ میں ترجمہ کے ساتھ اسے درج کر دیتا ہوں۔

إنّ الفارس والروم كانوا متسلطين على ملاك الأرض يأخذون منهم الخراج ولم يكونوا ملاك الأرض ولا ورثوها عن آبائهم وأجدادهم فقاتل المسلمون أولئك المتغلبين حتى دفعوهم عن سواد الشام والعراق۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۲۹)

"ایران وروم والے زمین کے حقیقی مالکوں پر زبردستی قبضہ جما کر مسلط ہو گئے تھے، ان سے مالگزاری وصول کرتے تھے، حالانکہ زبردستی قبضہ جمانے والوں کا یہ طبقہ) نہ زمین کا مالک ہی تھا اور نہ اپنے باپ دادوں سے وراثت ہی میں یہ زمینیں ان تک پہنچی تھیں، درحقیقت مسلمان انہی پر زبردستی قبضہ جما کر مسلط ہونے والوں سے لڑے تا آنکہ شام وعراق کے زرخیز سرسبز علاقوں سے ان کو مار بھگایا۔"

ان متغلبین اور متسلطین کو تو مسلمانوں نے مار بھگایا اور جس علاقے سے وہ بھگائے اور کھدیرے گئے، اس کو

أبقاها ملكا لمن كان بها الكفرة وضرب عليهم الخراج (جلد ۶ ص ۱۷، فتح الباری)

اسی علاقے کے غیر مسلم باشندوں کی ملک میں باقی رکھا گیا اور ان پر (حکومت) کا خراج لگا دیا گیا۔

یوں متغلبین اور متسلطین کے اس طبقہ کو جو حکومت اور زمین پر واقعی کام کرنے والوں کے درمیان جبراً گھس پڑا تھا ان کو درمیان سے نکال کر کے باہر کر دیا گیا۔

دوسرا مسئلہ یعنی عراق وشام کے سواد (زرخیز علاقے) کو اسی علاقے کے کسانوں اور وطن داروں کی ملک میں باقی رکھا گیا، یہ تو خیر ہماری فقہ کا عام مسئلہ ہے لیکن عقلی بات جو شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے نقل کی گئی، قدیم تاریخی وثائق کا بھی یہی کھلا ہوا اقتضا ہے۔

عہد فاروقی میں عراق کے کاشتکاروں کا ایک وفد مدینہ منورہ پہنچا تھا، وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے ابن الرافیل نامی مرزبان نے حضرت عمرؓ کو خطاب کرکے جو تقریر کی تھی، کتابوں میں وہ محفوظ ہے اس نے یہ کہتے ہوئے کہ

يا أمير المؤمنين إنا قوم من أهل السواد وكان أهل فارس قد ظهروا علينا وأضروا بنا ففعلوا وفعلوا حتى ذكر النساء۔

امیر المومنین ہم لوگ سواد عراق کے رہنے والے ہیں، ایران والے ہم پر چڑھ بیٹھے تھے، انھوں نے بہت دکھ دیا، انھوں نے یہ کیا یہ کیا۔ (آخر میں ابن رافیل نے) عورتوں تک کا ذکر کیا، (یعنی عورتوں کے ساتھ بھی ایرانی دست درازیوں سے کام لیتے تھے۔)

ان الفاظ میں پہلے تو متغلبین اور متسلطین کی چیرہ دستیوں کا ذکر کیا، اس کے بعد ابن رافیل نے عرض کیا۔

فلما سمعنا بكم فرحنا بكم وأعجبنا ذلك فلم نرد كفكم عن شيء حتى أخرجتموهم عنا۔ (کتاب الخراج قرشی ص ۵)

پھر جب ہم نے آپ (مسلمانوں کی آمد) کی خبریں سنیں تو ہم بہت خوش ہوئے اور یہ بات ہمیں پسند آئی، اسی لئے کسی چیز سے آپ لوگوں کو ہم نے نہیں روکا اور مزاحمت کی، بالآخر ایرانیوں کو آپ لوگوں نے ہمارے درمیان سے نکال باہر کیا۔

اسی کتاب کی دوسری روایت میں ہے کہ ابن الرافیل نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ

۱؎ عراق وشام کی زرعی زمینیں ان ہی علاقوں کے اصلی کاشتکاروں کے قبضہ میں رہیں، کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان جاگیرداروں اور زمینداروں کا طبقہ باقی نہ رہا، یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے، ائمہ کو خصوصاً امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب وتلامذہ کا فیصلہ ہے کہ جن کاشتکاروں کا قبضہ تھا ان ہی کو اسلام نے ان زمینوں کا قانونی مالک بھی تسلیم کر لیا تھا اگر محدثین میں بغیر قانونی دل ودماغ والے بعض افراد ایسے بھی گذرے ہیں جو امام اور ان کے تلامذہ کے اس فیصلہ سے ناراض تھے ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں بسط وتفصیل کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ امام پر قطعاً بیجا اعتراض کیا گیا ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھو احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۲،

عَلٰی مَا صَالحتمونا

کن شرائط پر ہماری اور آپ کی صلح ہوئی

جواب میں حکومت کے قانونی مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس مطالبہ کی تکمیل تم کرو۔ اور

لکم ارضکم واموالکم (۲۰ ص)

اپنی زمین اور اپنے اموال کے تم مالک بنے رہو۔

بہرحال کہنا یہی ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں سے مقابلہ ومقاتلہ کی بڑی غرض یہ تھی کہ حکومت اور زمین پر واقعی کام کرنے والوں کاشتکاروں کے درمیان تغلب اور تسلط کے زور سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا جو طبقہ گھس پڑا تھا، اسی طبقہ کو خارج کرکے زمینوں کو ان کے اصلی مالکوں اور ان پر کام کرنیوالوں کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ کوئی نیا پیدا کیا ہوا ایسا نظریہ نہیں ہے جسے اس زمانہ کے ماحول کی پیداوار قرار دیا جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی ہندوستان کا ایک محدث ومجتہد آج سے دو سو سال پہلے اسی خیال کو ظاہر کر چکا ہے اس زمانہ میں ظاہر کر چکا ہے جب ہندوستان تو ہندوستان دنیا کے پردہ پر شاید ہی کوئی اور ہوگا جس کے دل پر اس کا خطرہ بھی گذرا ہو، اور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جو کچھ بھی فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو ذخیرہ عہد نبوت وخلافت کا پایا جاتا ہے اس کا صحیح طور پر جو بھی جائزہ لے گا، قدرۃً اسی نتیجہ تک پہنچنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ ابن الرافیل کا بیان ایک معمولی مثال ہے لیکن چونکہ یہ ایک جامع مثال تھی، اسی لئے اس کا تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ایران وروم میں جو کچھ بھی کیا گیا، یہ اسی نبوت کبریٰ کا صحیح اور واقعی منشا تھا، جس کے بعد آسمان سے بنی آدم کی راہنمائی کے لئے رہتی دنیا تک کوئی روشنی آنے والی نہ تھی استیعاب کے لئے تو کسی مستقل کتاب ہی کا انتظار کرنا چاہئے۔ یہاں اجمالاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان چند مقدس فرامین کے درج کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ براہ راست خود ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ منصوبہ تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے قریش مکہ کا تو عام معاشی پیشہ تجارت اور بیوپار تھا، لیکن مدینہ منورہ والوں کا حال قریش سے مختلف تھا ان کے معاش کا زیادہ دار مدار نخلستانی اور زرعی پیداواروں پر تھا۔ صحاح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشہور فقرہ ہے یعنی

کان یشغلھم عمل اراضیھم (مسلم)

ہماری انصاری بھائیوں یعنی مدینہ والوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں رہتی تھی۔

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے زمینداری کے یعنی زمین کے حصہ کے مالک بن کر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں عموماً مروج نہ تھا، بلکہ براہ راست اپنی اپنی زمینوں پر خود کام کرنے کے وہ عادی تھے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ مدینہ منورہ کے دو قبیلوں اوس وخزرج میں قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک موقعہ پر ان کو آتے ہوئے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"کھڑے ہو جاؤ اپنے سردار کی تعظیم کے لئے"[1]

بہرحال اپنے قبیلہ کے وہ سردار تھے اور ان کا شمار مدینہ منورہ کے غیر معمولی سربرآوردہ معززین میں تھا۔ یہود میں بھی وہ خصوصی احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاوڑے سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیوں میں گٹھے پڑے ہوتے تھے۔

(کتاب الکسب سرخسی ضمیمہ مبسوط ج ۳۰، ص ۲۴۵)

کچھ بھی ہو، مدینہ کے باشندوں کی اکثریت جہاں تک کتابوں سے پتہ چلتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاروں اور کسانوں ہی کی تھی، البتہ گنے چنے کچھ لوگ جن میں سب سے زیادہ قبیلۂ اوس کے ایک خاندان بنی حارثہ نامی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ضرورت سے زیادہ زرعی زمینیں ان کے قبضہ میں تھیں۔ زرعیات یعنی زرعی مسائل کی متعلقہ روایتوں کے بیان کرنے والے زیادہ تر اسی خاندان کے افراد ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور حضرت رافع بن خدیج صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، خود ان کا قول بخاری میں نقل کیا گیا ہے۔

کنا اکثر الانصار حقلا (بخاری)

تمام انصار (یعنی مدینہ منورہ والوں) میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

"ہمارے" سے مراد ان کی خاص اپنی ذات نہیں ہے بلکہ بنی حارثہ کا خاندان ہے جس کے ایک فرد وہ بھی تھے، صحاح کی عام کتابوں میں مزروع کی جگہ "حقلا" کا لفظ ہے اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ مطلب دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے۔

بہرحال ضرورت سے زیادہ ہونے کی وجہ سے یا یوں سمجھئے کہ اتنی زیادہ زمینیں اس خاندان کے قبضہ میں تھیں کہ خود براہ راست ان کی آبادکاری ان لوگوں کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے زائد از ضرورت اراضی کا من مانے شرائط پر حاجت مندوں کے ساتھ بندوبست کر دیا کرتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک صاحب جن کا نام اُسید بن ظہیر تھا، حضرت رافع بن خدیج کے بھتیجے تھے، ان کا بیان کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے کہ

ہم میں (یعنی بنی حارثہ والوں میں) رواج تھا کہ زمین جو ضرورت سے زیادہ ہوتی، اسے تہائی، چوتھائی نصف پر یا بیں شرط بندوبست کیا کرتے تھے کہ اچھے قطعات اور کھجت کے جس حصہ تک پانی پہنچ سکتا ہے اسکی پیداوار بھی ہم لیں گے۔ اور ہر قطعہ کی تین تین کیاریوں کی پیداوار بھی ہم لیں گے۔

اسی کے بعد اُن کے الفاظ ہیں کہ

وکان العیش اذ ذاک شدید

اس زمانہ میں زندگی بڑی دشوار تھی۔

---

[1] کسی کی تعظیم کیلئے کھڑا ہونا اسلامی حکم نہیں ہے۔ رسول اللہ صلعم سے بکثرت روایات ہیں اس سے ممانعت مروی ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضہ کیلئے صحابہؓ کو کھڑے ہو جانے کیلئے فرمانا محض اسلئے تھا کہ وہ بیمار اور زخمی تھے اور ان کو سہارا دیکر اتارنے کی ضرورت تھی۔ اس روایت میں لفظ "تعظیم کیلئے" مولانا گیلانی کا اضافہ ہے ورنہ روایت میں صرف قوموا للسید کہ کے الفاظ آئے ہیں ۱۲ طلوع اسلام

بظاہر ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کڑی کڑی شرطوں پر بھی لوگ زمینوں کو ان کے مالکوں سے لینے پر مجبور تھے آگے انہی کے جو الفاظ اس روایت میں ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ

بے چارے کسان لوہا یعنی کدال پھاوڑہ ہل کے ساتھ کام کرتے تھے اور کچھ نفع اُن کو مل جاتا تھا۔ (کنز العمال ج ۸ص ۱۴۷)

یہی زمانہ تھا کہ دنیا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوتے ہیں، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ پر بھی آپ کی نظر پڑتی ہے جس کا نام "مزارعت" (کھیتی باڑی کا معاملہ) ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینداروں یعنی زمینوں کو بندوبست کرکے کرایہ لینے والوں کے خاندان بنی حارثہ میں ایک دن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، سامنے اسی خاندان کے ایک صاحب جن کا نام ظہیر تھا ان کی زمین تھی جس پر ہری بھری کھیتیاں لہلہا رہی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا

ما احسن زرع ظہیر

ظہیر کی کھیتی کتنی اچھی ہے۔

لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ ظہیر کی کاشت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ " یہ زمین کیا ظہیر کی نہیں ہے"؟ تب آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ

جی ہاں زمین تو ظہیر ہی کی ہے لیکن اس میں کاشت فلاں شخص نے کی ہے۔

یہ پہلی اطلاع تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس سلسلہ میں پہنچی، اور آپ کو معلوم ہوا کہ زمین کے مالک یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی زمین دوسروں کو کرایہ پر خاص شرائط کے تحت دیدیتے ہیں اور پیداوار کا کافی حصہ حاصل کرتے ہیں۔

اس وقت تو جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے، فوری فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ ظہیر جو زمین کے زمیندار تھے اُن کو حکم دیا کہ کاشت کرنے کے مصارف کاشتکار کو ادا کرکے اپنی کھیتی تم واپس لے لو، حکم کی تعمیل اسی وقت کردی گئی (دیکھو کنز العمال ج ۸ص ۹۴، بحوالہ طبرانی و ابن ابی شیبہ) لیکن آپ کے اس فیصلہ سے صحیح طور پر لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشائے مبارک کا پتہ نہ چلا۔ غالباً اسی کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ مختلف الفاظ میں روایتوں میں کیا گیا ہے، سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بنی حارثہ کے چند سربرآوردہ افراد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب کیا جن میں حضرت رافع بن خدیج کے دو چچا جن میں ایک کا نام تو یہی ظہیر تھا، ظہیر کے بھائی کا نام ظہیر یا مظہر تھا، ان دو چچاؤں کے سوا حضرت رافع کے ایک ماموں اور ان کے چچازاد بھائی اسید بن ظہیر کا بھی ذکر اسی سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے، حضرت ظہیر کہتے تھے کہ

دعانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما تصنعون بمحاقلکم،

رسول اللہ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو۔

حالانکہ اجمالاً بنی حارثہ کے طریقہ کار کا علم اسی وقت رسول اللہ کو ہو چکا تھا۔ جب ان کے محلہ کے کھیتوں کا آپ نے معائنہ فرمایا تھا،

مگر تفصیلی حالات کے پوچھنے کیلئے آپ نے پھر بلایا اور واضح لفظوں میں اپنے منشائے مبارک سے آگاہ کیا۔ بنی حارثہ کے زمینداروں تک کو خود حضرت ظہیرؓ اور اسی خاندان کے دوسرے افراد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس فرمان کو پہنچاتے ہوئے جن الفاظ میں اطلاع دی تھی، کتابوں میں آج تک وہ محفوظ ہیں، حضرت رافع کا بیان ہے کہ

سمعت عمی یحدثان اھل الدار انہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن کراء الارض۔ (جمع الفوائد ص۲۵۷ ج۱ بحوالہ صحاح ستہ)

یعنی اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سُنا، دار (محلہ والوں) سے دونوں کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ نے ممانعت کردی ہے۔

اسی طرح اپنے ماموں جن کے نام کا پتہ نہ چل سکا، ان کا ذکر کرتے ہوئے حضرت رافع ہی کہا کرتے تھے :-

دخل علی خالی یوما فقال نھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن امر کان لکم نافعا وطواعیۃ اللہ ورسولہ انفع لنا وانفع لکم۔ (کنز العمال ص۳، بحوالہ مصنف عبدالرزاق)

میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کیلئے نفع بخش تھا لیکن اللہ اور رسول کی فرمانبرداری ہمارے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔

اسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کا اعلان ان الفاظ میں حضرت رافعؓ کے ماموں نے کیا کہ

نھی عن الثلث والربع وکراء الارض (ایضاً)

تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمین دینے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا ہے۔

اسید بن ظہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "فرمان نبوی" کو اپنے خاندان والوں تک جس طریقہ اور جن الفاظ میں پہنچایا تھا اس کا تذکرہ شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے کیا ہے، لکھا ہے کہ ایک دن بنی حارثہ میں اسید بن ظہیر پہنچے اور کہنے لگے کہ

یا بنی[1] حارثۃ قد دخلت علیکم الیوم مصیبۃ

اے بنی حارثہ والو! آج تم لوگوں پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔

گھبرا کر لوگ پوچھنے لگے کیا ہوا، تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے لوگوں کو ان الفاظ میں حضرت اسیدؓ نے مطلع کیا کہ

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء الارض (مبسوط ص۱۲ ج۲۳)

کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بجائے ایک دفعہ کے بنی حارثہ کے مختلف افراد کے ذریعہ وقفہ وقفہ سے آپ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچایا گیا ہو، روایتوں میں اس احتمال کی بھی کافی گنجائش ہے، بخاری کی ایک روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے، کچھ بھی ہو بنی حارثہ والوں تک ان ہی کے خاندانی

---

[1] مبسوط کے مطبوعہ نسخہ میں بنی خارجہ چھپ گیا ہے لیکن یہ طباعت کی غلطی ہے، صحیح بنی حارثہ ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خود حضرت رافع بن خدیج اگرچہ صحابی ہیں اور ممتاز صحابیوں میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری جس زمانہ میں مدینہ منورہ میں ہوئی، اسوقت وہ بہت نوعمر تھے، اسی لئے بدر کی جنگ میں نوعمر قرار پانے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت سے روک دیا تھا، احد میں شریک تھے، تیر سے زخمی بھی ہوئے ۸۳ سال کی عمر میں وفات کہتے ہیں کہ اسی زخم سے ہوئی جو احد میں تیر سے لگا تھا، درمیان میں بندرہا، آخر عمر میں وہی کھل گیا جس سے وفات ہوئی۔

افراد کے ذریعہ سے رسولؐ اللہ کا فرمان مقدس جو پہنچا تھا، الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ بخاری و مسلم اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے مثلاً بخاری میں ہے:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء المزارع،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زرعی زمینوں کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع کر دیا ہے۔

یا مسلم میں ہے:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یوخذ لارض اجرا و حظ،

منع کر دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ زمین کے مقابلہ میں یعنی زمین کو بندوبست کر کے معاوضہ یا کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے۔

قریب قریب اسی قسم کے الفاظ صحاح ستہ کی دوسری عام کتابوں میں ہیں۔ نیز اسی خاندان کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کے متعلق وقتاً فوقتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا جاتا تھا، مثلاً نسائی میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ تھوڑا بہت اناج بھی (زمین کا مالک کاشتکار سے نہیں لے سکتا؟) فرمایا گیا نہیں،

پوچھا گیا کہ (غلہ نہ سہی) تین (بھوسہ کٹوا) بھی (زمین کا مالک زمیندار نہیں لے سکتا) فرمایا گیا، نہیں۔

کنز العمال میں ابوداؤد، مسند احمد وغیرہ کے حوالہ سے رافع بن خدیجؓ ہی کی طرف یہ روایت بھی منسوب کی گئی ہے کہ

زمین کو تہائی چوتھائی یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بندوبست کرنا جائز نہیں ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں جو باتیں پوچھی جا سکتی تھیں، سب ہی پوچھی جا چکی تھیں، صرف ایک شکل نقدی بندوبست یعنی فی قطعہ کچھ روپیہ بطور کرایہ کے زمین کا مالک کاشتکار سے وصول کرے، اس کے متعلق انہی رافع بن خدیج سے پوچھا گیا تو بخاری میں ہے کہ جواب میں انھوں نے فرمایا،

امّا الذھب والورق لم یکن یومئذٍ

تو سونا چاندی اس زمانہ میں نہ تھا۔

جس کا مطلب ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتا ہے جو حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ

ای یکری بھما ولم یرد نفی وجودھما

یعنی سونے چاندی پر کھیتوں کے بندوبست کرنے کا رواج اس زمانہ میں نہ تھا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس زمانے میں سونے چاندی کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت رافعؓ سے زمینوں کی نقدی بندوبست کا جب سوال کیا جاتا تو کبھی یہ فرماتے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے تو منع نہیں کیا

بخاری میں ان کا فتویٰ بایں الفاظ درج کیا گیا ہے

لیس بھا باس بالدینار والدرھم (کتاب المزارعت) "یعنی اشرفی اور درہم کی شکل میں زمین کے کرایہ لینے میں مضائقہ نہیں ہے۔

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ان کا اجتہاد تھا، یہ خیال کر کے کہ جب عہدِ نبوت میں نقدی بندوبست کا رواج ہی نہ تھا تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع کیسے کر سکتے تھے اور جس چیز سے رسول اللہؐ نے منع نہیں کیا ہم اس سے کیوں منع کریں[1]۔ مگر پھر انہی کو اس کا خیال بھی گذرا کہ کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب روک دیا ہے تو کرایہ خواہ بشکل جنس اور پیداوار ہو یا بالشکل نقد ہو، سب ہی کرایہ ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان ہی کی طرف اس قسم کے فتوے بھی کتابوں میں منسوب ہیں، حضرت رافعؓ کے پوتے جن کا نام عمران ابن سہل تھا انھوں نے ایک دفعہ اپنے دادا حضرت رافعؓ کو آ کر اطلاع دی کہ

دادا جان میں نے دو سو درم پر اپنی زمین کرایہ پر دیدی ہے۔

یہ سُن کر اپنے پوتے عمران سے حضرت رافعؓ نے کہا:

دعہ فانّ النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم نھی عن کراء الارض،

چھوڑ دو اس کو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ دادا بن جانے اور وہ بھی اس وقت جب ان کے پوتے عمران کاروبار کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے تھے، اس زمانہ کا فتویٰ ہے یعنی عمر کے آخری زمانے کی رائے ہے۔

بہرحال بقول ابن حزم نقدی بندوبست کا فتویٰ جو حضرت رافعؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ ان کا اجتہادی فتویٰ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہے، پھر فتویٰ کی دونوں صورتیں یعنی جواز و عدم جواز دونوں ہی ان کی طرف منسوب ہے جواز پر استدلال ان ہی کا یہ نقل کیا جاتا ہے کہ عہدِ نبوت میں نقدی بندوبست کا رواج نہ تھا مگر عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے خود ان ہی کی سمجھ میں آیا کہ مطلقاً کرایہ پر زمین کے بندوبست کرنے کی صورت نقدی بندوبست کی بھی ہے، پھر یہ کیوں جائز ہو، حافظ ابن حزم کا بیان ہے کہ مطلقاً کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے کی ممانعت کا حکم براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حضرت رافعؓ جو منسوب کرتے تھے، اس کے راوی کوئی ایک دو آدمی نہیں ہیں، بلکہ:-

الذین رووا عموم النھی عن رافع ابن عمر وعثمان وعمران وعیسیٰ، ابنا سھل بن رافع وسلیمان بن یسار وابو النجاشی (جلد ۵ ص۲۲۳ محلی)

زمین کو مطلقاً کرایہ پر بندوبست کرنے سے رسولؐ اللہ نے منع فرمایا، اس حدیث کو رافع سے ابن عمر، عثمان، عمران، اور عیسیٰ جو حضرت رافع کے صاحبزادے سہل کے بیٹے ہیں اور سلیمان اور ابو النجاشی سب ہی روایت کرتے ہیں۔

ان میں ان کے گھر کے آدمی یعنی پوتوں کے سوا ابو النجاشی کے نام کو جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ وہ صاحب ہیں جو بر سول حضرت رافعؓ کے ساتھ

---

[1] صحاح ستہ اور موطا وغیرہ میں ایک ایسی روایت بھی پائی جاتی ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نقدی بندوبست کرنے کی اجازت کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حضرت رافعؓ منسوب کرتے تھے لیکن حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ دراصل راوی کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن مسیبؒ کا قول تھا جسے راوی نے کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے جس سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے۔ دیکھو فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۔

رہے ہیں، حافظ ابن حجر نے ابو النجاشی کا قول نقل کیا ہے کہ

چھ سال تک رافع کے ساتھ میں رہا۔ (ج ۵ ص ۱۰ فتح)

خصوصاً اُن کے پوتوں کا جب یہ بیان ہے کہ ان کے دادا حضرت رافع بندوبست سے بھی منع کرتے تھے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آخر عمر میں ان کی رائے یہی ہو گئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً کرایہ سے جب ممانعت فرمادی ہے تو نقد کی شکل میں بھی زمین کا کرایہ لینا زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں کیلئے کیسے جائز ہو سکتا ہے، کیونکہ کچھ بھی ہو یہ بھی کرایہ ہی کی ایک شکل ہے اور شاید نسبتہً زیادہ اطمینانی شکل، بلکہ بقول شمس الائمہ سرخسی جیسا کہ انھوں نے اسید بن ظہیر کے اس پیغام کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کا ذکر کر چکا ہوں یعنی بنی حارثہ والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "مقدس فرمان" سے آگاہ کرتے ہوئے حضرت اسیدؓ نے کہا تھا: "اے بنی حارثہ آج تم پر بہت بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی"۔ شمس الائمہ نے لکھا ہے کہ خلاصہ جس کا یہی ہے کہ

بندوبست کر کے زمین سے استفادہ کا کوئی طریقہ اگر زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں کے لئے باقی رہتا تو ممانعت کا یہ حکم ان کیلئے مصیبت ہی کیوں ہوتا

اسی کے بعد وہ لکھتے ہیں:

فھو دلیل لابی حنیفۃ رحمۃ اللہ وظاھر قولہ علیہ السلام ازرعھا او امنحھا اخاک۔

یہ دلیل ہے امام ابو حنیفہؒ کے فتوے کی اور یہی بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے سمجھ میں آتا ہے (جو زمین کے مالکوں کو آپ نے دیا تھا یعنی خود تم اپنی زمین میں کاشت کرو یا اپنے بھائی کو مفت معاوضہ لئے بغیر دیدو۔

آخر میں اسی موقعہ پر ان کے قلم سے یہ فقرہ نکل گیا ہے:

یدل علی سد باب المزارعۃ علیھم مطلقاً: (مبسوط ج ۲۳ ص ۱۲)

یہی بتا رہا ہے کہ زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں پر مطلقاً مزارعت یعنی زمین بندوبست کرنے کے قصہ ہی کو ختم کر دینا مقصود تھا۔

قطعی طور پر زمینداری کا الغاء اور ختم کرنا، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک اور نصب العین تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مفاد اسی کو قرار دیتے ہوئے آگے انھوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ

بہ یستدل من المتعسفۃ انہ لا یجوز استیجار الارض بالذھب والفضۃ لمقصود المزارعۃ

تشدد پسند علماء میں جن لوگوں کا فتویٰ ہے کہ سونے چاندی پر بھی زمین کو بندوبست کرنا جائز نہیں ہے وہ اسی سے استدلال کرتے ہیں۔

تشدد پسند علماء میں کون کون سے حضرات ہیں، اس کا ذکر تو آگے آرہا ہے لیکن اتنا تو بہر حال معلوم ہوا کہ

"سد باب المزارعۃ مطلقاً"

یعنی سرے سے زمینداری کے طریقہ کو اٹھا دینا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تھا، یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ اسلامی علماء میں ایک طبقہ ہمیشہ اسی خیال پر اصرار کرتا رہا ہے اور اس باب میں سب سے زیادہ شہرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، عام کتابوں میں بھی ان کا مذہب نقل کیا جاتا ہے کہ مزارعت (یعنی زمینداری) کے طریقہ کو وہ غیر مشروع فعل قرار دیتے تھے، اگرچہ بعد کو ان کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے

کہ نقدی بندوبست کی اجازت دیتے تھے لیکن ہم جب دیکھتے ہیں کہ "اسلامی قانون" کی تدوین میں حصہ لینے والوں کی بڑی اکثریت نقدی بندوبست کو بھی ناجائز قرار دینے پر اصرار کرتی رہی ہے، ابن حزم نے محلی میں نقل کیا ہے کہ شام کے امام اوزاعی کہا کرتے تھے:

کان عطاء ومکحول ومجاھد والحسن البصری یقولون لا تصلح الارض البیضاء بالدراھم ولا بالدنانیر (ج ۸ ص ۲۱۳)

عطاء، مکحول، مجاہد، حسن بصری سب ہی کہتے تھے کہ زرعی زمینوں کا روپے پیسے سے بندوبست کرنا جائز ہے نہ اشرفیوں سے۔

پھر دوسرے مختلف ائمہ کے اقوال کا ذکر کرکے آخر میں ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے:

فھولاء عطاء ومجاھد ومسروق والشعبی، وطاؤس[1] والحسن وابن سیرین والقاسم بن محمد کلھم لا یری کراء الارض اصلاً لا بدنانیر ولا بدراھم ولا بغیر ذلک (محلی ج ۸ ص ۲۱۳)

پس یہ ہیں عطاء، مجاہد، مسروق، شعبی، طاؤس، حسن بصری، ابن سیرین، قاسم بن محمد یہ سب کے سب زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کو جائز نہیں سمجھتے، نہ روپے پر اور نہ اشرفیوں پر، نہ ان کے سوا کسی اور چیز پر۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ الامصار یعنی سارے مرکزی شہروں جن میں اسلامی قانون کی تدوین وترتیب کا کام ابتدائے اسلام میں انجام دیا گیا ہے ان میں سے مشکل ہی سے کوئی ایسا شہر ہے جس کے مستند علماء اور ائمہ کا نام اس فہرست میں رہ گیا ہے۔ مکہ کے عطاء، مدینہ کے قاسم بن محمد، بصرہ کے خواجہ حسن اور ابن سیرین، کوفہ کے شعبی ومسروق، یمن کے طاؤس، دمشق کے مکحول، سب ہی کا جب یہ اتفاقی فیصلہ تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ "متعسفہ" (تشدد پسند) کے لفظ سے شمس الائمہ نے کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ امام ابوحنیفہ کی طرف عام کتابوں میں مزارعت کے عدم مشروعیت یا غیر قانونی ہونے کے فتوی کو جو منسوب کیا گیا ہے، اس میں خواہ مخواہ ترمیم کی جائے جب "اسلامی قانون" کی تدوین وترتیب کے کام کرنیوالے بزرگوں کا عام خیال ہی تھا کہ جیسے زمینداری کی تمام صورتیں ناجائز ہیں، اسی طرح نقدی بندوبست بھی جائز نہیں ہے۔

تعجب اس پر ہوتا ہے کہ خود شمس الائمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ کا تذکرہ بھی کیا ہے خلاصہ جس کا یہ ہے کہ

چند آدمی اکٹھے ہوئے اور باہم ان میں طے ہوا کہ ان میں ایک طرف سے تو فدان[2] (ہل بیل) دیا جائے گا، دوسرے صاحب تخم کا انتظام کریں گے، تیسرے صاحب جوتنے بونے سینچنے کا۔

الغرض کاشت میں جو کچھ کام کیا جاتا ہے اس کو انجام دینگے اور چوتھے صاحب کی طرف سے زمین پیش کی گئی۔

طے یہ پایا کہ پیداوار کو چاروں آپس میں بانٹ لیں گے۔

اسی شرط پر کھیتی کی گئی، کھیتی جب تیار ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ معاملہ پیش ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے قصے کو سن کر جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ زمین کے مالک یعنی زمیندار صاحب کے سوا جتنے بھی تھے ان میں

---

[1] طاؤس کی طرف صحاح میں ایسے اقوال بھی منسوب کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نقدی بندوبست کو ناجائز سمجھتے ہوئے بٹائی کے طریقہ کی اجازت دیتے تھے لیکن حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں لکھا ہے کہ طاؤس ان لوگوں میں تھے جو کسی شرط پر زمین کے بندوبست کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۱۹)

[2] فدان شاید پائدان کا معرب ہے ہل پر پاؤں رکھکر کسان چلاتے ہیں، شاید اسی لئے اس کو پائدان کہتے ہوں اور اسی سے عربی میں فدان بن گیا ہو۔ ۱۲

ہل چلانے والے صاحب کو تو مروجہ کرایہ (اجرمثل) دلادیا اور کاشت کا کام جن صاحب نے کیا تھا ان کو ایک درہم یومیہ کے حساب سے مزدوری دلوائی گئی اور جو کچھ پیدا ہوا تھا آپ نے اس کا مستحق ان صاحب کو قرار دیا جنھوں نے تخم دیا تھا، باقی رہے زمین کے مالک زمیندار صاحب شمس الائمہ کی روایت کے الفاظ ہیں کہ

الغی الارض

زمین (کے حق) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لغو قرار دیا۔

یعنی زمیندار کو کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دلایا، خود ان الفاظ کی شرح شمس الائمہ نے یہ کی ہے کہ

یعنی لم یجعل لصاحب الارض من الخارج شیئاً (مبسوط ج ۲۳ ص ۱۶)

زمین کے مالک زمیندار کو پیداوار کا کچھ حصہ نہ دلایا گیا۔

آگے اس کی بھی تصریح شمس الائمہ نے کی ہے کہ

الحدیث صحیح وکل قیاس بمقابلتہ متروک (ص)

حدیث بالکل صحیح ہے اور (ہر عقلی اعتراض کی) صحیح حدیث کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ الغائے زمینداری اور جاگیرداری کے طریقہ کو ختم کرنے کے لئے انسانیت کے سب سے بڑے آخری ہی خواہ کی طرف سے اور کیا کیا جاتا، حالانکہ عرب عموماً ایک غیر زرعی ملک تھا لیکن جونہی آپ کو موقع ملتا ہے پہلے خود کھیتوں کا معائنہ فرماتے ہیں اور کھیتی کرنے والوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اُن کے یہاں کن باتوں کا رواج ہے اور جب پہلی اطلاع زمینداری کے طریقہ کی آپ کو ہوتی ہے تو اسی وقت ٹوکتے ہیں اور معاملہ کو زمیندار و کاشتکار کے درمیان عملاً ختم کرا دیتے ہیں، پھر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں زمیندار خاندان کے لوگوں کو بلاتے ہیں، اپنا منشائے مبارک سب کو سمجھاتے ہیں۔ گذر چکا ہے کہ مدینہ کے زمینداروں کے خاندان کے ممتاز افراد حضرت ظہیر اور ان کے بھائی مہیر یا مظہر نامی حضرت رافع بن خدیج کے دونوں چچا نیز اُن کے چچازاد بھائی اسید بن ظہیر اور ان کے ماموں کو بلا کر اپنے اس پیغام کے ساتھ کہ آئندہ زمینوں کو کرایہ پر بندوبست نہ کیا جائے، ان ہی زمینداروں کے خاندان بنی حارثہ میں پہنچتے ہیں اور یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اپنی برادری والوں کو آگاہ کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ ہے کہ زمین کے متعلق جو آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ

الارض ارض اللہ

زمین اللہ کی زمین ہے۔

اس کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو عملاً یہ فیصلہ کر کے کہ زمین کے مالک (یعنی زمیندار کو آپ نے کچھ نہ دلایا گویا یہ سمجھا دیا کہ جیسے ہوا، روشنی، فضا، حرارت وغیرہ کو بھی نباتات کے اُگانے میں دخل ہے، لیکن جیسے ہوا کو قدرت کی ہوا، آفتاب کی روشنی اور حرارت کو قدرت کی روشنی اور حرارت قرار دیکر کوئی اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ کسی خاص علاقہ کی ہوا یا روشنی و حرارت کو اپنی طرف کسی ذریعہ سے منسوب کرلے اور اس علاقہ کی ہوا یا روشنی و حرارت سے فائدہ اٹھانے والوں سے کسی شکل میں کرایہ وصول کرے، بجنسہٖ یہی حال مٹی کے اس تودے کا ہے جس کو ہم زمین کہتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہوا نور و حرارت وغیرہ قدرتی چیزوں کے متعلق کرایہ وصول کرنے کا رواج چونکہ دنیا میں نہیں ہوا، اس لئے ان کے متعلق تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ تاریخ کے کس عہد سے مٹی کے اس تودے اور خاک دھول کے اس مجموعہ کے رقبہ کو اپنی طرف منسوب کرکے اس رقبہ میں کاشت کرنے والوں سے کرایہ کے وصول کرنے کا رواج چلا آرہا تھا بلکہ رفتہ رفتہ یہ رواج اتنا قوی اور مستحکم ہوگیا کہ سب کچھ اسی کا سمجھا جانے لگا جس نے اپنی طرف زمین کے اس خاص رقبہ کو منسوب کرلیا تھا، یا کسی وجہ سے منسوب کرنے کا اس کو موقع مل گیا تھا اور اس پر کاشت کرنے والے غریبوں پر گویا سمجھا جاتا تھا کہ زمین کا مالک احسان کر رہا ہے، جو جوتنے بونے کی اجازت اپنی زمین میں خاص شرطوں کے ساتھ دیدی اسی لئے من مانے مطالبات زمین کے مالک وصول کرتے تھے اور بلا چون وچرا غریب کاشتکار ان کے مطالبات کو پورا کرتا رہتا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش تر زمین کے متعلق اس نظریہ کو کسی نے پیش کیا ہو کہ جیسے ہوا، روشنی وغیرہ قدرتی چیزیں ہیں، زمین بھی ایک عام قدرتی عطیہ ہے جس پر کام کئے بغیر استفادہ کا کوئی حق ان لوگوں کو نہیں پہنچتا جن کی طرف منسوب ہو کر زمین کے کسی رقبہ کو ان کی ملک قرار دیدیا گیا ہو۔

پس کچھ تو رواج کی عمومیت اور نامعلوم زمانہ سے قلوب میں اس رواج کی استواری و استحکام اور کچھ اسلئے بھی کہ عرب خصوصاً حجاز ایک غیر زرعی علاقہ تھا، آپ پڑھ چکے ہیں کہ مدینہ میں لوگ نخلستانوں اور کھیتوں کا کچھ کام بھی جو کرتے تھے تو براہ راست خود کرتے تھے، زمین کے مالک بن کر دوسروں سے آمدنی وصول کرنے کا طریقہ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے صرف ایک خاندان بنی حارثہ ہی کی حد تک محدود تھا اور آگاہ کرنے کی جتنی ممکنہ صورتیں تھیں بنی حارثہ کے ان زمیندار گھرانوں کو ان ذرائع سے مطلع کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھا نہ رکھا لیکن ظاہر ہے کہ اس کاروبار سے جن لوگوں کا تعلق نہ تھا ان کو اس سے دلچسپی لینے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، ہر ایک اپنے اپنے کام میں مشغول تھا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب کا شاید نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں پر جب فتوحات کا دروازہ وسیع ہوا، عرب سے باہر کے ممالک میں باطمینان زمینداری کے طریقہ سے آمدنی لوگ حاصل کر رہے تھے اور طرفہ تماشا اسی کے ساتھ یہ بھی پیش آیا کہ مدینہ منورہ کے زمینداروں کے خاندان بنی حارثہ کے جن بزرگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست مسئلہ سمجھایا تھا اور انہی کی زبانی اپنا فرمان بنی حارثہ کے دوسرے افراد تک پہنچایا تھا یعنی حضرت رافع بن خدیج کے چچا ظہیر و مہیر ان کے ماموں اور شاید حضرت اسید بن ظہیر بھی، ان سارے بزرگوں کی وفات ہو چکی تھی، ان سب کی جانشینی حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذمہ ہوئی۔ اصابہ میں لکھا ہے کہ

کان عریف قومہ بالمدینۃ (ص ۱۸۶)

اپنی قوم (بنی حارثہ) کے وہی نمائندہ تھے مدینہ میں۔

یہی صورت حال تھی جب مسلمانوں کو جہاں کہیں موقع مل رہا تھا دوسروں کی دیکھا دیکھی زمینداری کا معاملہ بھی کرنے لگے کہ اچانک ذکر کرنے والے اس فرمان نبوی کا چرچا کرنے لگے۔ جو بنی حارثہ کے زمینداروں میں مختلف ذرائع سے پہنچا تھا کیونکہ عملاً آمدنی حاصل کرنے کا

یہ طریقہ گو بنی حارثہ ہی والوں میں مروج تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابیوں تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچ چکی تھی، حافظ ابن حزم نے لکھا ہے کہ

قد روی النہی عن الکراء جملۃ للارض جابر وابوھریرۃ وابوسعید وابن عمر (ج ۵ ص ۲۲۰)

زمین کو مطلقاً کرایہ پر بندوبست کرنے کی ممانعت والی حدیث (رسول اللہ کے صحابیوں) حضرت جابرؓ و ابوہریرہؓ و ابوسعید خدریؓ اور ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے

صحیح طور پر یہ کہنا تو دشوار ہے کہ ان صحابیوں نے براہ راست اس حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا، یا مدینہ کے زمینداروں کے اسی خاندان بنی حارثہ کے بزرگوں سے یہ خبر ان تک پہنچی تھی، کم از کم ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق تو یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ براہ راست ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کا موقع نہ ملا تھا، صحاح ستہ میں ان کے متعلق یہ روایت پائی جاتی ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے وہ کرایہ پر کچھ دن تک اپنی زمین بندوبست کیا کرتے تھے تا اینکہ ان کو یہ اطلاع ملی کہ بنی حارثہ کے زمینداروں کو اس کاروبار سے رسول اللہ نے روک دیا تھا۔ سننے کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بنی حارثہ والوں میں پہنچے۔ حضرت رافع بن خدیج سے ان کی ملاقات ہوئی، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے ان بوڑھے زمینداروں کی وفات ہو چکی تھی جن کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منشا سے آگاہ کیا تھا، صرف یہی رافع بن خدیج ہی رہ گئے تھے، انھوں نے اپنے چچا وغیرہ کے حوالہ سے ابن عمر کو مطلع کیا کہ جو بات آپ تک پہنچی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع فرمایا تھا، یہ صحیح ہے کہ اپنے بزرگوں سے میں نے بھی سُنا ہے ــــ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر اس حکم کی اشاعت صحابہ کرام میں نہ ہو سکی حتیٰ کہ ابن عمرؓ جیسے آدمی بھی ناواقف تھے اور جیسے ابن عمر کو خبر ہوئی رفتہ رفتہ دوسروں تک بھی یہ بات پہنچی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی بنیاد جس حقیقت پر قائم تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تہ تک بہت سے حضرات پہنچ نہ سکے، خیال ان کو یہی ہوا کہ دھوکہ اور فریب جھگڑے رگڑے کا خطرہ بندوبست کرنے کی جن صورتوں میں پیدا ہو سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ان ہی کی حد تک محدود ہوگا۔

کنز العمال میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے عبداللہ بن عمرؓ کے صاحبزادے سالم کی طرف ایک روایت منسوب کی گئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ بیچارے حضرت رافع بن خدیج ہی پر وہ تشدد کا الزام لگاتے تھے، کہا کرتے تھے

اکثر رافع بن خدیج علی نفسہ۔ (اپنے اوپر رافع نے زیادتی سے کام لیا تھا)

اور اس عام خیال کو کہ ہر چیز کا مالک جب اپنی مملوکہ چیز سے مستفید ہو سکتا ہے، مکان کو کرایہ پر چلا کر کرایہ لے سکتا ہے یا اونٹ، بیل گاڑی، سب ہی کا لوگ کرایہ لیتے ہیں تو زمین کا مالک بھی اپنی مملوکہ زمین کو بندوبست کر کے کرایہ کی آمدنی کیوں نہیں لے سکتا، حضرت سالمؒ کبھی کبھی قسم کھا کر کہا کرتے تھے۔

واللہ لنکریھا کراء الابل (کنز ج ۸ ص ۴۳)

خدا کی قسم جیسے اونٹ کو کرایہ پر چلایا جاتا ہے میں اپنی زمین کو کرایہ دوں گا۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ کہئے یا عبرت انگیز لطیفہ تیسری صدی کے عالم امام ابوجعفر طحاوی مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی نظریات کی وکالت میں جلنے والے جانتے ہیں کہ شاید وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔

لیکن اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ساحلِ نیل کے زرعی خطہ کے جس خاص ماحول میں وہ گھرے ہوئے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ دوسرے زرعی ممالک کی طرح زمینوں کو ان کے مالک بندوبست بطریقۂ زمینداری وجاگیرداری کرکے مصر میں آمدنی نہ حاصل کرتے ہوں گے۔ بظاہر اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاوی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فیصلہ آیا جس میں کام کرنے والوں کو ان کے کام کے مطابق معاوضہ دلایا گیا اور زمین کے مالک یعنی زمیندار کے حق کو لغو اور بے بنیاد ٹھہراتے ہوئے جو کچھ پیدا ہوا تھا اس کا مستحق تخم دینے والے کو قرار دیا گیا تو سنداً اس پر اعتراض کی گنجائش جب امام طحاوی کو نظر نہ آئی، تب اس عجیب وغریب دعوی کو پیش کرتے ہوئے کہ کھیت کی مٹی میں ملا دینے کے بعد تخم کا وجود تو غائب اور مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے، پھر جو چیز نابود ہو کر کھپ کھپا گئی، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو بنیاد بنا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ تخم والے ہی کو دلا دیا ہو، اور زمین جو ہر حال میں قائم ودائم رہتی ہے اسی کے مالک کو کچھ نہ دلایا جائے۔ مبسوط میں شمس الائمہ سرخسی نے طحاوی کے اس نظریہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

قال البذر یصیر مستھلکا لان النبات یحصل بقوۃ الارض

یعنی تخم تو مٹی میں مل کر لیا میٹ ہو جاتا ہے اور جو کچھ اگتا ہے زمین ہی کی قوتِ نشوونما سے اگتا ہے۔

اور اسی کو واقعہ قرار دیتے ہوئے طحاوی نے اپنی تائید میں یہ مثال بھی پیش کی ہے کہ جانوروں اور مویشیوں میں بچوں کی جو حقیقت ماں کے ساتھ ہوتی ہے یعنی بچے ماں کے پیٹ سے جیسے پیدا ہوتے ہیں اور جو ماں کا مالک ہوتا ہے وہی بچوں کا بھی ہوتا ہے، اسی طرح زمین کو بھی سمجھنا چاہئے کہ زرعی پیداواروں کی گویا وہ ماں ہے، اس لئے عقل کا اقتضا یہی ہے کہ جو زمین کا مالک ہے، وہی اس کی پیداواروں کا بھی مالک ہو، انھوں نے پوچھا ہے کہ مویشیوں میں جب یہ نہیں دیکھا جاتا کہ بچے کس نر کے نطفہ یا تخم سے پیدا ہوئے ہیں، اسی لئے نر جس کے تخم اور نطفہ سے بچے پیدا ہوتے ہیں، اس کے مالک کو کچھ نہیں ملتا بلکہ سب کچھ اسی کا ہوتا ہے جو بچوں کی ماں کا مالک ہوتا ہے۔ پھر اس کے بالکل برعکس بھلا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس کو سب کچھ ملنا چاہئے تھا یعنی زمین کا مالک اس کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دلایا اور جسے کچھ نہ ملنا چاہئے تھا یعنی تخم کا مالک، اسی کو سب کچھ دلا دیا گیا۔

آپ دیکھ رہے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فیصلہ صحیح سند کے ساتھ پیش ہو رہا ہے لیکن ماحول اور رسم ورواج کے دباؤ کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے صاحبِ بصیرت غیر معمولی فہم وذکا رکھنے والے عالم کی نظر اس "بنیاد" تک نہ پہنچ سکی جس پر دنیا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ مبنی تھا۔

حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ شمس الائمہ سرخسی نے اگر طحاوی کی تنقید کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

ولکن ھذا وھم منہ — یہ ابو جعفر طحاوی کا وہم ہے۔

اسی کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہے کہ مستند راویوں اور صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورۂ بالا فیصلہ جب مروی ہے تو قیاس یعنی عقلی احتمال آفرینیوں کا اس کے مقابلہ میں وزن ہی کیا رہ جاتا ہے، پھر طحاوی کی اس قیاسی رائے کی تنقید کرتے ہوئے شمس الائمہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کھیت کی مٹی میں مل کر تخم لیا میٹ ہو کر کلیتہً نابود اور معدوم ہو جاتا ہے، یہ دعوی بھی طحاوی کا عجیب ہے اگر یہی واقعہ ہوتا تو مختلف تخموں سے مختلف پیداواریں کیسے حاصل ہو سکتی تھیں بلکہ جو کچھ بویا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے، یہی رات دن کا مشاہدہ اور تجربہ ہے اور صرف یہی نہیں

شمس الائمہ نے آگے بڑھ کر زمین اور جانوروں کی پیداوار میں جو فرق ہے اس کو بھی واضح کیا ہے، حاصل جس کا یہی ہے کہ مویشی میں تو بچوں کی ماں کا مالک مثلاً بکری کا مالک بکری کی پرورش کرتا ہے اسکو کھلاتا ہے پلاتا ہے اور بکری اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے، ان کو پالتی ہے، اسلئے بکری کا مالک ہی بکری کے بچوں کا مالک قرار دیا جاتا ہے لیکن نطفہ یا تخم جس سے بچے پیدا ہوتے ہیں اس کے ساتھ نر کے مالک کے جذبات کا ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔[1]

شمس الائمہ قریب قریب اس مسئلہ میں حقیقت تک گویا سمجھنا چاہیئے پہنچ چکے تھے بآسانی اس کے بعد ان کے سامنے یہ بات آسکتی تھی کہ "زمین کا مالک زمینداری کے طور پر اپنی زمین کو جب بندوبست کرتا ہے تو جو کچھ پیداوار ہوتی ہے اس میں زمیندار کے عمل اور اس کی کد و کاوش کو کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن باوجود اس کے جو آمدنی وہ حاصل کرتا ہے اس میں اور اس طریقہ کار میں کیا فرق ہے کہ کسی خاص علاقہ کی ہوا، یا روشنی اور حرارت یا ازیں قبیل دوسری قدرتی چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرکے آمدنی حاصل کی جائے مگر اب اسے کیا کہئے کہ یہ سب کچھ فرمانے کے بعد بھی "زمین کے مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دلایا" اس فیصلہ کے ماننے کی گنجائش شمس الائمہ بھی اپنے اندر پیدا نہ کرسکے اور یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ

ان المراد من الالغاء انه لم يجعل لصاحب الارض شيئاً من الخارج

(حق زمینداری) کو لغو قرار دینے کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ پیداوار سے کچھ حصہ زمیندار کو رسول اللہ نے نہیں دلایا۔

اور خود اپنی طرف سے انھوں نے فرض کر لیا کہ جیسے رواج کے مطابق فدان (ہل بیل) والے کو معاوضہ دلایا گیا یعنی اجر مثل دلایا گیا تھا اسی طرح اس زمانہ کے دستور کے مطابق زمین کے مالک یعنی زمیندار کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجر مثل کی صورت میں معاوضہ دلایا ہوگا۔ مگر اس مفروضہ کی دلیل کیا ہے کیا بیان کرنے والوں نے صراحۃً یا کنایۃً اس کی طرف اشارہ کیا ہے؟ نہ اس کا کوئی جواب انھوں نے دیا ہے اور نہ دے سکتے تھے کیونکہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ زمیندار کو پیداوار سے نہ سہی باہر سے کسی قسم کا معاوضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلایا تھا، لے دیکر بس یہی خیال سب کو پریشان کئے ہوئے ہے کہ زمیندار بیچارہ بھی تو آخر زمین کا مالک تھا، مزدور کو مزدوری ملی، ہل بیل والے کو اجر مثل دیا گیا تخم والے کو تو ساری پیداوار ہی دلادی، لیکن سب سے بڑے حصہ دار مالک زمین اور زمیندار اسی کو کچھ نہ دلایا گیا ہو، یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی اور سچی بات یہ ہے کہ دنیا جن موروثی رواجوں اور عادتوں کی زنجیروں میں تاریخ کے نامعلوم زمانے سے جکڑی چلی آتی تھی ان زنجیروں کا ٹوٹنا اور ان سے آزاد ہوکر سوچنے کا موقعہ آج بھی جب آسان نہیں ہے تو ذرا سوچئے جب ساری دنیا جاگیرداروں اور زمینداروں ہی کی دنیا تھی، دنیا کی ساری حکومتیں ان کی پشت پناہ تھیں خصوصاً تاریخ کا وہ عہد جس میں مشرق ایرانی شہنشاہیت کے آثار کی بیڑیوں میں اور مغرب رومن امپائر کے پنجوں میں گرفتار تھی، جاگیرداروں اور زمینداروں پر ان شہنشاہیتوں کی دیواریں قائم تھیں، اسی لئے اس دیوار کی ہر اینٹ چھوٹی ہو یا بڑی، ان ہی جابر حکومتوں کی سرپرستی میں خود بھی محفوظ تھی اور ان کے مفروضہ حقوق بھی محفوظ تھے۔

اتنے قطعاً مخالف اور حد سے زیادہ ناموزوں زمانہ میں سچ پوچھئے تو جو کچھ بھی ہوگیا اور جس حد تک اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشائے مبارک کے جس پہلو کی تعمیل کی بھی سعادت دنیا کو میسر آئی، میں تو اسی کو غنیمت اور بسا غنیمت سمجھتا ہوں۔

(باقی آئندہ)

باب المراسلات

(۱) "اقرب" کا قرآنی مفہوم

اپریل کا رسالہ کل موصول ہوا۔ ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا ایک کتابچہ جس میں مرتد غلام اور یتیم اولاد کے مسائل ہیں پہنچ چکا ہے اس میں میرا مضمون "محجوب الارث" بھی ہے۔ یہ مضمون آج سے ۳۶ سال قبل لکھا تھا۔ مذہبی تقلید کا کبھی کوئی اثر میرے اوپر نہیں رہا مگر اس وقت جب یہ رسالہ میں نے لکھا تھا علمی تقلید کا ایک پردہ میری بصیرت پر ضرور تھا جسکو ادھر کچھ عرصہ ہوا قرآن کریم نے اٹھا دیا۔ یعنی اقرب کا صحیح مفہوم مجھکو معلوم ہوگیا۔ قرآن نے یہ لفظ وراثت میں مورث کیلئے استعمال کیا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون

وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون

ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون

آیات وراثت میں ان تینوں مقامات پر اقرب کا لفظ مورث ہی کیلئے ہے۔ فقہاء فرائض کو غلط فہمی ہوئی کہ انھوں نے اقرب کے لفظ کو ورثہ کیلئے استعمال کیا یعنی الٹے راستے پر چلے اور جب یہ کہیں ٹھیک بیٹھا اور کہیں نہیں بیٹھا تو ایسی الجھن میں گرفتار ہوئے کہ تاویل پر تاویل کرتے رہے اور کسی پہلو سے اس کا مفہوم متعین نہ کرسکے۔ چنانچہ مولانا عبدالحی مرحوم لکھنوی فرنگی محلی نے جو اس آخری دور میں علماء حنفیہ میں معتمد علیہ تھے سراجی کی شرح شریفیہ میں صاف لکھا کہ اقرب کے جو مفہوم بیان کئے گئے ہیں ان سے یتیم پوتا محجوب نہیں ہوتا۔ لازم ہے کہ اس کا مفہوم متعین کیا جائے۔ فقہاء نے "الاقرب فالاقرب" کا خود ساختہ قاعدہ بھی بنایا ہے۔ رسالہ محجوب الارث میں میں نے اسی قاعدہ کو اپنی بحث کی بنیاد قرار دیا ہے کیونکہ اسی قاعدہ سے وہ یتیم پوتے کو محجوب قرار دیتے ہیں۔ اس قاعدہ کی جتنی شکلیں انھوں نے متعین کیں ان سب پر میں نے بحث کی اور یہ واضح کردیا کہ اس سے یتیم پوتا محجوب نہیں ہوسکتا۔ اللہ کا کس زبان سے شکر ادا کروں کہ اسوقت جبکہ میں بھی فقہاء کی علمی تقلید کی وجہ سے اقرب کو ورثہ کے لئے استعمال کرتا تھا اللہ نے مجھکو اس کے صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی کی اور میں نے رسالہ محجوب الارث میں لکھا کہ اقرب سے بجز اس کے کچھ مراد نہیں لیا جاسکتا کہ

اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلاواسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ لیکن بوقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔

اب جبکہ قرآن نے اس کا مفہوم میرے اوپر واضح کردیا صرف دو ایک لفظ کی تبدیلی اس میں ہوگی یعنی

مورث اس رشتہ دار کا اقرب ہے جو بلاواسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ لیکن بوقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔

اس ایک لفظ اقرب کے صحیح مفہوم کے سمجھ میں آجانے کے بعد قانون وراثت نسبی رشتہ داروں میں بالکل واضح ہوجاتا ہے اور اقرب فالاقرب کا قاعدہ جو فقہاء نے بنایا ہے نہ صرف غیر ضروری بلکہ بے معنی ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اقرب تو قرآن کی رو سے صرف ایک ہے یعنی مورث۔ باقی رہے ورثہ

تو قرآن نے تفصیل کے ساتھ ان کے حصے بیان کر دیئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس وارث کی موجودگی میں کون وارث محروم ہو جاتا ہے یا کس وارث کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔

یہ میں نے اس واسطے لکھا ہے کہ قرآن سے قانونی وراثت بنانے والوں کیلئے اس ایک لفظ کے صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد بڑی روشن شاہراہ کھل جاتی ہے اور ان تمام الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے جو فقہ فرائض میں پیش آتی ہیں۔ فللہ الحمد من قبل ومن بعد

(علامہ حافظ) محمد اسلم جیراجپوری۔ جامعہ نگر۔ دہلی۔ ۱۰ اپریل ۵۳ء

---

(۲) مولانا تمنا کے نام | ایک خونیں حدیث

مکرمی مولانا! سلام ورحمت

آج جی چاہا ہے کہ "طلوع اسلام" کے ذریعے آپ سے چند باتیں عرض کروں۔ آپ کو معلوم ہے کہ نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی اس کے باوجود مسلمانوں ہی نے مسیح علیہ السلام کی دوبارہ آمد تسلیم کر کے آپؐ کے بعد امکان نبوت کا اعلان کر دیا۔ اس کی بنیاد بخاری کی ایک حدیث ہے۔ قرآن مجید میں اول سے آخر تک کہیں بھی مسیحؑ یا کسی نئے پرانے نبی کی آمد کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے ساتھ ہی مہدی کی آمد کا ضمیمہ بھی حدیث ہی کی بنا پر شائع کیا گیا۔ اس طرح عملاً آیہ ختم نبوت کی تکذیب کا ارتکاب خود مسلمانوں سے سرزد ہوا۔ یہ تو تھا نبوت کا حال، اب آیئے فکر و اجتہاد اور تنقید و تحقیق کی طرف، تو اس کا دروازہ قرآن نے کہیں بند نہیں کیا بلکہ تمام الہامی کتب سے زیادہ اس کی طرف توجہ دلائی اور غور و فکر نہ کرنے والوں کے حق میں سخت سے سخت لفظ استعمال فرمائے۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو دو تین ابتدائی صدیوں میں منحصر کر کے آئندہ کو اس کے امکانات ختم کر دیئے۔ یعنی

۱۔ نبوت جو قرآن نے ختم کی تھی، جاری رہی۔

۲۔ اور فکر و تدبر جس کو جاری رکھنا چاہا تھا اسے بند کر دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح و مہدی کے لباس میں مدعیوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا اور تنقید و اجتہاد کے دروازے بند ہو گئے۔

محترم مولانا! عام شہرت کے لحاظ سے چار اماموں پر اجتہاد ختم اور چھ جامعین حدیث پر حدیث کی تنقید و تحقیق ختم ہو گئی۔ حالانکہ ان بزرگوں نے اپنے آپ کو خاتم نہیں کہا اور نہ انھیں یہ حق پہنچتا تھا۔ اس زمانے میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے تنقید حدیث کا خاص ملکہ عطا فرمایا ہے اور آپ عموماً انہی اصول و قواعد پر تنقید و تحقیق کرتے ہیں جو گزشتہ بزرگوں نے وضع کئے ہیں۔ لیکن چونکہ ان چھ میں سے ایک نہیں۔ اس لئے آپ کی تنقید ان قواعد کے مطابق ہوتے ہوئے بھی قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔

قوم کی اس خلاف قرآن اور خلاف عقل روش سے جو نقصان آج تک پہنچے اور بالخصوص ہمارے زمانے میں پہنچ رہے ہیں، ان کی ہولناکیوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور جب تک حدیث مسیح و مہدی کی تنقید کا حق ادا نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہولناکیاں بڑھتی ہی رہیں گی۔

اب میں اجازت چاہتا ہوں کہ چند مدعیوں کا ذکر کروں جو آپ کیلئے ہر چند غیر معلوم نہیں ہوں گے لیکن اس خط کے دوسرے قارئین میں سے اکثر کے علم میں اضافہ ہوگا۔

۱ — مہدی جونپوری نے دعویٰ کیا "انا مھدی مبین مراد اللہ"۔ میں ظاہر مہدی اللہ کے ارادے سے مبعوث ہوا ہوں — میرا منکر کافر و بے دین ہے۔ مجھے خدا نے اولین و آخرین کا علم دیا ہے، معانی قرآن کا فہم اور خزانہ قرآن کی کنجی عطا کی ہے۔"

اس کے مریدوں کا عقیدہ ہے کہ اس کے دعویٰ (۹۰۵ھ) سے قیامت تک کے مسلم جو اس کے مومن نہیں، کافر مطلق ہیں۔ اور محمد صلعم کے سوا تمام انبیاء سے افضل ہے، محمد صلعم کے برابر ہے اور صاحبِ شریعت رسول ہے۔

۲ — مہدی سوڈانی نے دعویٰ کیا کہ "جو شخص میرے احکام کی تعمیل نہ کرے اسے بحرِ عدم میں غرق کرنے کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے" اور اس کا انکار بھی ناقابلِ عفو جرم سمجھا جاتا ہے۔

۳ — محمد محمود واحد گیلانی (۸۰۰ھ) کہتا ہے کہ آیہ عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا۔ (تیرا رب عنقریب تجھے مقامِ محمود میں جگہ دیگا) میں میری بعثت کا ذکر ہے۔ اس کا ایک شعر بھی سنئے

از محمد گریز در محمود کاندراں کاست اندریں افزود

مولانا! اگر اس شخص کو حدیث نے سند دی ہوتی تو کیا یہ آیت کی گستاخی کی جرأت کر سکتا تھا؟

۴ — عبدالعزیز طرابلسی۔ قادیانی مدعی کی طرح کئی رنگ بدلتا رہتا تھا۔ کبھی کہتا میں ہی محمد مصطفیٰؐ ہوں، کبھی کہتا میں علی مرتضیٰؓ ہوں اور کبھی مہدی منتظر بن بیٹھتا۔

۵ — ادریس رومی نے سلطان بایزید ترکی کے عہد میں مہدویت کا دعویٰ کیا۔ اس کے ۸۰ خلفا تھے، ایک دن سب کو جمع کرکے کہنے لگا مجھے کشف سے معلوم ہوتا ہے کہ میں مہدی ہوں۔ تم بھی اپنے باطن کی طرف توجہ کرو اور جو کچھ تم پر ظاہر ہو اس سے مجھے اطلاع دو، انھوں نے توجہ کے بعد متفقہ بیان دیا کہ "آپ مدعیِ برحق ہیں"۔ دیندار سلطان بایزید بھی اس کا حامی بن گیا۔ چند روز بعد ادریس نے پھر باطن کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ الہام ربانی نہ تھا بلکہ القائے شیطانی تھا، فوراً دعویٰ مہدویت سے رجوع کیا، اپنے خلیفوں اور سلطان کو بھی اطلاع کرا دی، جلدی ہی سنبھل گیا۔

یہ ہے پورے ۸۱ عدد مخلص اہلِ کشف کے متفقہ تاریخی کشف کا حال۔ اگر حدیث سامنے نہ ہوتی تو اول تو ایسا کشف ہی نہ ہوتا اور اگر ہو جاتا تو خلافِ قرآن ہونے کی وجہ سے بے تامل شیطانی القا سمجھ لیا جاتا۔ اس زمانے کے بہت سے مومنینِ مسیح و مہدیِ موعود بھی اپنے خیالی کشف و رؤیا پر اپنے ایمان کی بنیاد رکھتے ہیں۔

۶ — ابو عبداللہ ابن شیاس صمیری (۳۴۲ھ) عوام سے گزر کر اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس کے دام میں پھنس گئے تھے، اپنے نمائندوں اور نامہ بر کبوتروں کے ذریعے سے مختلف شہروں کی خبریں حاصل کرکے لوگوں کو بطورِ غیب دانی سنایا کرتا تھا۔ معتقد لوگ اس کو علام الغیوب اور رب العالمین یقین کرنے لگے تھے۔

۷۔ ابو علی منصور الحاکم بامر اللہ (عہد حکومت ۳۸۶ھ تا ۴۱۱ھ) اس نے عجیب و غریب دعوے کئے۔ حکم دیا کہ بازار یا مسجد میں جہاں میرا نام لیا جائے سننے والے فوراً تعظیم کو کھڑے ہو جائیں اور ساتھ ہی سجدے میں گر پڑیں۔ اس نے بزرگوں کو گالیاں دیں، علما کی جان لی۔ وادی تیم کے بہت سے باشندے آج تک اس کی رجعت کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور روئے زمین پر حکومت کرے گا۔

۸۔ عبد العزیز باسندی (علاقہ صغانیان) ۳۲۲ھ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ بڑا شعبدہ باز تھا، حوض میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتا تو مٹھی سرخ دیناروں سے بھری ہوتی۔ لوگ پروانوں کی طرح اس کی طرف دوڑتے اور اس کی خاک قدم کو سرمۂ چشم بناتے۔ وہ کہتا تھا کہ میں مرنے کے بعد دنیا میں لوٹ کر آؤں گا۔

۹۔ ماضی قریب میں علی محمد باب (ولادت ۱۲۳۵ھ) نے مہدویت کا دعویٰ کیا۔ قرۃ العین طاہرہ نے جو بہت قابل اور بے حد حسین عورت تھی اس کی شان میں قصیدے لکھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

دو ہزار احمد مجتبیٰ زبربود آں شہ اصفیا　　　　شدہ مختفی، شدہ در خفا متدثرا متزملا

مہدیوں کے بعد مسیحوں کا انتظار بھی از روئے حدیث ضروری تھا چنانچہ شیخ بھیک۔ شیخ محمد خراسانی اور ابراہیم جبلہ نے مسیحیت کا دعویٰ کیا بہاء اللہ ایرانی نے بھی اپنے آپ کو حدیث مسیح کا مصداق ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی، اس کے پیشرو باب نے اپنی الہامی کتاب "بیان" کے متعلق لکھا کہ "جو شخص اس پر ایمان نہیں لاتا دونوں جہان کے عمل اسے نجات نہیں دلا سکتے اور میرا منکر قطعاً کافر ہے"۔ بہاء اللہ نے اپنی "کتاب اقدس" میں لکھا کہ جس شخص نے مجھے قبول نہیں کیا وہ گمراہ ہے اگرچہ وہ ہر طرح کے اعمال بجا لائے (بحوالہ "ائمہ تلبیس")

خون کے دریا

محترم مولانا! اس مختصر مکتوب میں کہاں تک گنواؤں کہ ہمارے دفتر روایات نے کتنے مسیح اور کتنے مہدی پیدا کئے اور ابھی کتنے اور پیدا ہوں گے۔ پھر یہ داستان اور زیادہ طویل اور بے حد ماتم انگیز ہے کہ متبرک "حدیث" اور ان مقدس "حدیث زادوں" کی برکت سے مسلمانوں کے خون کے کتنے دریا سطح زمین کو رنگین کر گئے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق بھی ایک آدھ تاریخی چیخ سن لیجئے۔

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں بہبود نامی ایک شخص زنگی جمعیت کا سردار ہوا، اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور زنگیوں نے اس کو نبی تسلیم کر لیا، اس جدید مذہب میں مسلمانوں کا قتل کرنا، اہل بیت نبوی اور صحابہ کرام کو گالیاں دینا ثواب کا کام تھا، ان لوگوں نے قریباً ایک کروڑ مسلمانوں کو قتل کیا۔ یہ علوی و غیر علوی مسلمانوں کے شجر فتنہ کی ایک معمولی شاخ تھی۔

شیعہ سنی آویزش

علقمی اور نصیر طوسی کی شیعیت نے بغداد اور نواح بغداد میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، اس لئے کہ وہ ان کی خانہ زاد حدیثوں سے متفق نہیں تھے۔ ورنہ قرآن مجید میں تو شیعی غیر شیعی کا کوئی نشان بھی نہیں، بغداد کی اسلامی سلطنت کی اس خودکشانہ تباہی کا حال سن کر عیسائی ملکوں میں بہت خوشیاں منائی گئیں۔

[illegible] میں فدائی مسلمانوں نے دہلی کی جامع مسجد میں جبکہ سنی مسلمان نماز جمعہ ادا کر رہے تھے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ (قول حق)

یہ سب کچھ ہمارے کارہائے نمایاں کی دیگ کا صرف ایک دانہ ہے ورنہ جس طرح ہم نے اپنی تاریخ کو نئی نئی نبوتوں اور فرقہ بندیوں سے

لالہ زار بنایا، شاید دنیا کی کوئی قوم اس قسم کا خونیں تسلسل پیش نہیں کر سکتی۔ یہ سزا تھی قرآن مجید کو چھوڑنے اور خود ساختہ روایتوں کو دین کا درجہ دینے کی۔ بزرگ محدثوں نے اپنے امکان بھر بہت کچھ چھان پھٹک کی لیکن ان کے پاس وحی تو نہیں آتی تھی کہ وہ اصل و نقل میں ضرور ہی تمیز کر لیتے۔ بشر ہی تو تھے جو عہد نبوت کے صدیوں بعد اپنے گھروں سے نکلے، شہر بہ شہر پھرے اور لوگوں کی زبانوں سے باتیں اخذ کیں جو انھوں نے کئی کئی واسطوں سے سن رکھی تھیں، سیاسی داؤ پیچ نے طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا تھا، ارباب غرض ہر طرف چھا رہے تھے۔ ادھر انسانی حفظ روایت کا حال یہ ہے کہ ایک ہی جگہ ایک واقعہ رونما ہوتا ہے اسی دن اس کے مختلف حاضرین اپنے اپنے گھروں میں جا کر اپنا چشم دید بیان دیتے ہیں تو اس میں اختلاف اور بعض دفعہ تضاد تک پیدا ہو جاتا ہے۔

آہ حدیث ان مدعیانہ فتنوں کو اٹھانے والے عموماً اعلیٰ ذہن و علم کے ملّا ہی ہوتے ہیں اور ان کے شکار سادہ لوح، خوش عقیدہ عوام عوام حدیث شریف کی بنا پر صدیوں سے مسیح و مہدی کا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر کوئی چالاک یا بر خود غلط نفسیاتی مریض اس انتظار سے فائدہ اٹھا کر حدیث موعود کا جامہ اوڑھ لیتا ہے۔ منتظر قوم میں سے کئی ایک اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ بعض آیات کو بھی توڑ مروڑ کر اس حدیث کے ساتھ چسپاں دیتا ہے اور یہ تو پہلے سے ہی مسلم چلا آتا ہے کہ سنت کتاب پر قاضی ہے۔ سنت کتاب کی شارح ہے، سنت کتاب کے خاص کو عام اور عام کو خاص کرنے کا حق رکھتی ہے، سنت کتاب کے اجمال و ابہام کی موضح ہے۔ کتاب نہ ہو تو سنت بحیثیت مفسر و متمم اس سے بہت بہتر کام دے سکتی ہے، سنت نہ ہو تو کتاب بے کار ہے۔ سنت کتاب کی جس آیت کو چاہے منسوخ قرار دے سکتی ہے۔ کتاب کو ہرگز یہ اجازت نہیں کہ سنت کا بال بیکا کر سکے۔ کتاب اگر کہہ دے کہ ابراہیمؑ سچا نبی تھا اور حدیث (جو شمع سنت ہے) کہہ دے کہ ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے تو لامحالہ کم از کم دو جھوٹ تو اسی کتاب میں سے تلاش کرنے پڑیں گے جو اپنے آپ کو (خواہ مخواہ) بے اختلاف کہے جا رہی ہے۔ تاکہ حدیث، محدث اور راوی کی سہ گونہ اقنومیت پر حرف نہ آجائے۔

متضاد ثواب اب جو منتظرانِ مسیح و مہدی مدعیانِ مسیحیت و مہدویت کو تسلیم کرتے ہیں تو وہ اپنے خیال میں ایک اہم دینی حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور جو اس مدعی اور اس کے پیروؤں کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں وہ بھی اپنے دین کو اس کے نئے فتنے سے بچانے کے لئے بہت بڑا کارِ خیر انجام دیتے ہیں۔ پھر یہ لوگ آپس میں کشت و خون کا بازار گرم کرتے ہیں۔ جو مارتے ہیں وہ مارنے کا ثواب حاصل کرتے ہیں جو مرتے ہیں وہ دین کے لئے مرنے کا ثواب پاتے ہیں۔ دونوں طرف کے ملاؤں نے ان کو ثواب کا انجکشن لگا رکھا ہے، دونوں جتھے اپنے آپ کو مومن و مسلم و ناجی اور دوسرے کو کافر بے دین اور جہنمی بتاتے ہیں، دونوں کے پاس اپنی اپنی حدیثیں اور اقوال بزرگاں موجود ہیں اور غریب قرآن کو بھی ان اقوال و احادیث کی حاشیہ برداری کرنا ہی پڑتی ہے۔ اگر وہ ان کی حمایت و تائید نہ کرے تو جو باقی آیات منسوخ ہونے سے بچ گئی ہیں اور ان پر بھی بزرگان دین نسخ کی چھری پھیر دیں گے اور عملاً تو

یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا

پروردگار! میری قوم تو قرآن کو چھوڑ چکی ہے۔

ہو ہی چکا ہے۔

آخری گذارش حضرت مولانا! آخر سادہ اور خوش عقیدہ مسلمانوں کو حدیثوں کے پھیلائے ہوئے اور ملاؤں کے فرمائے ہوئے متضاد ثوابوں سے کب نجات ملے گی؟ ہمارے عوام جو ہماری دولت و قوت ہیں کب تک ان مسیحوں اور مہدیوں کے اقرار و انکار کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے؟ کب تک ان غیر یقینی مرویات کی بنا پر امت محمدیہ آپس کی خونریزیوں سے تباہی و ہلاکت کے گھاٹ اترتی رہے گی؟ یہ پرانی اور نئی داستان ثواب میں اس غرض سے دہرا رہا ہوں کہ خدارا بخاری شریف کی حدیث نزول مسیح کے چہرے سے منسوبیت الی الرسولؐ کا ریشمیں نقاب اتاریئے۔ قرآن کا مومن تو رسول اللہؐ کے بعد کسی نبوت کے دام میں بھی نہیں آئے گا لیکن حدیث والوں کے سامنے حدیث ہی کی کسوٹی پیش کیجئے۔ وقت آگیا ہے کہ اس جعل عظیم کی پوری ماہیت تلاش کر کے قوم کے سامنے رکھدی جائے اور غیر مُلّا زدہ طبقے کو دعوت دی جائے کہ اس پر غور کریں۔ کیونکہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے بچاؤ کا بہت کچھ انحصار اس پر بھی ہے۔

مخلص قدیم عرشی

استدراک

ہم محترم عرشی صاحب سے متفق ہیں کہ آمد مسیحؑ و مہدی سے متعلقہ حدیث کی حقیقت کا بے نقاب کیا جانا ضروری ہے لیکن اس سے وہ تباہیاں رک نہیں سکیں گی جن کا شکار صدیوں سے امت ہو رہی ہے۔ اس کا تو صرف ایک ہی علاج ہے کہ کوئی صاحب ہمت مرد مسلمان کسی خطۂ زمین میں قرآن کا قانون نافذ کردے اس کے بعد امت کو کسی آنے والے کا انتظار نہیں رہے گا۔ آنیوالے کا عقیدہ یاس و نو امیدی کا پیدا کردہ ہے اور اس کا علاج تابناک امیدوں کی وہ درخشندگی ہے جو قرآنی نظام سے ساری فضا کو بقعۂ نور بنا دیتی ہے اس کے بعد کسی کو کسی آنے والے کا انتظار رہتا ہی نہیں۔ (طلوع اسلام)

آئندہ اشاعت سے

محترم پرویز صاحب کا

طاہرہ بیٹی کے نام

خطوط کا سلسلہ شروع ہوگا۔ یہ سلیم ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

منکرِ حدیث کون ہے؟

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق

گوئرنگ کہا کرتا تھا کہ جھوٹی بات کو بار بار دہراتے چلے جاؤ۔ سو مرتبہ دہرادو تو وہ سچ بنکر دکھائی دینے لگے گی۔ گوئرنگ کو تو معلوم نہیں کہ اس باب میں کس قدر کامیابی ہوئی لیکن آج کل اُس کے اس حربہ کا استعمال بلا لائسنس ہو رہا ہے اور اس کا ہدف . . . طلوعِ اسلام ہے۔ طلوعِ اسلام کا مسلک اس اسلام کو نمایاں کرکے پیش کرنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے بوساطت نبی اکرم صلعم دنیا کو دیا۔ لیکن چونکہ اس اسلام کے اجاگر ہونے سے اس اسلام کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو عجمی ٹکسالوں میں وضع ہوا اور ملائیت کے سہارے آگے بڑھا اور آج جس کے محافظ ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔ اس لئے مُلاّ نے طلوعِ اسلام کی مخالفت کو اپنے لئے جہادِ عظیم تصور کر رکھا ہے۔ ہمارا مُلاّ طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لئے کہ وہ دعوت قرآن کی دعوت ہے اور مُلاّ بیچارہ قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے) اس لئے مُلاّ نے اس کے خلاف گوئرنگ کا حربہ استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے۔ اس نے یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے اور منکرِ حدیث وہ ہوتے ہیں جنہیں نہ خدا سے کوئی واسطہ ہوتا ہے نہ رسول سے۔ وہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتے ہیں جس میں (معاذ اللہ) نہ رسالت کا احترام باقی رہتا ہے نہ صحابہ کی تعظیم، نہ اسلاف کی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے نہ بزرگوں کی تکریم کا۔ یہ سب ملحد اور بے دین ہوتے ہیں جن سے مسلمانوں کو اس طرح بچنا چاہیئے جیسے اجلے کپڑے پہننے والا گیلے پینٹ (Wet Paint) سے بچتا ہے کہ انسان اس کے قریب گیا اور کپڑے ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئے۔ اس بہتان طرازی اور گوئرنگ بازی میں جماعت اسلامی سب سے پیش پیش ہے اسلئے کہ طلوعِ اسلام کی سب سے بڑی زد انہی کے مفاد پر پڑتی ہے۔ آیئے ذرا آج کی صحبت میں یہ دیکھیں کہ جو (انوکھا اسلام) طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس کا مجرم اکیلا طلوعِ اسلام ہی ہے یا اس جرم میں اور بھی شریک ہیں اور جو دوسرے لوگ اس جرم میں شریک ہیں ان میں اور طلوعِ اسلام میں فرق کیا ہے؟ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے اور مسئلہ ہے بڑا نازک اسلئے ہم گذارش کرینگے کہ آئندہ صفحات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے دیکھیئے اور ہر قسم کی جانبداری کو چھوڑ کر از خود فیصلہ کیجئے کہ حقیقتِ حال کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کا مسلک

طلوعِ اسلام جس مسلک کو ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہے وہ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

لہٰذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم (ہم سے مراد ہے ہر دور کے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ) قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں

اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں، ان جزئیات کے تعین میں ہم ان کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے جو اس سے پہلے اسی نہج و اسلوب پر ہوتی رہی ہیں۔ ان میں جو چیزیں ایسی ہوں گی جن میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں انھیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے گا۔ دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کرلی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کئے جائیں گے اور اس ساری کوشش کی اصل و بنیاد یہ ہوگی کہ کوئی شے قرآن کریم کے اصول سے نہ ہٹے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح۔ یہی رسولؐ اللہ نے کیا تھا اسی کے مطابق اس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علی منہاج النبوت قائم تھی اور اسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ (قرآنی دستور پاکستان ص۲۱۱)

اس اصول سے جو جزئیات متفرع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) دین (یعنی اسلامی نظام) کا اصل الاصول قرآن ہے۔ قرآن کے معانی واضح، اس کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی اور اسکی تعلیم کھلی کھلی اور نکھری ہوئی ہے۔

(۲) قرآن نے بالعموم دین کے اصول دیئے ہیں، ان اصولوں کی جزئیات اسلامی نظام حکومت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کریگا۔

(۳) سب سے پہلے ان جزئیات کو نبی اکرم صلعم نے متعین فرمایا۔ حضورؐ کے بعد دور خلافت علی منہاج النبوت میں ان جزئیات میں جن کے متعلق ضرورت سمجھی گئی مناسب ردوبدل ہوتا رہا۔ اور جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ سمجھی گئی انھیں علیٰ حالہ رہنے دیا گیا۔

(۴) جو نئے امور پیش آئے ان کے لئے نئی جزئیات متعین کی گئیں۔

(۵) آج جو اسلامی مملکت علی منہاج النبوت قائم ہوگی اسے بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ ان امور میں طلوع اسلام منفرد ہے یا ان لوگوں کا بھی بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اپنے آپ کو متبعین سنت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور طلوع اسلام کو منکر حدیث قرار دیتے ہیں۔

قرآن کی حیثیت

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ دین کے اصول سب کے سب قرآن کریم میں موجود ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی تفہیمات حصہ اول ص۳۳۹ پر لکھتے ہیں:-

باقی رہے اصول دین تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

مودودی صاحب رسائل و مسائل ص۶۵ پر لکھتے ہیں:-

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انھیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ۔

دین کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ یہ بتائے کہ کون کونسی چیزیں حلال ہیں اور کون کون سی حرام اور کون کونسی جائز ہیں اور کون کون سی ناجائز۔ ایک نظامِ مملکت کے اندر اسی چیز کا نام قانون قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی قانون یہ بتاتا ہے کہ فلاں کام کرنا جائز ہے اور فلاں ناجائز۔ سوال یہ ہے کہ انسانوں کے لئے اس قسم کی پابندیاں عائد کرنے کا حق کسے حاصل ہے۔ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن ص۵۹۸ پر لکھتے ہیں:۔

> حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اسی حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوم ص۳۸۹ پر لکھتے ہیں:۔

> اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابو داؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فہو مما عفا عنہ۔ حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا تو وہ معاف ہیں۔

طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جن احکام کو قرآنِ کریم نے صرف اصولاً بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات کا تعین نہیں کیا انھیں اللہ تعالیٰ نے دانستہ اسی طرح چھوڑ دیا ہے اگر منشائے خداوندی یہ ہوتا کہ ان کی جزئیات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں تو قرآن کریم میں ان جزئیات کو بھی خود ہی متعین کر دیا جاتا۔ اس باب میں مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے ص۵۰۷-۵۰۸ پر لکھتے ہیں:۔

> ایک دوسری حدیث میں ہے ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے لہذا ان کی کھوج نہ لگاؤ"
>
> ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدمِ تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہوگئی تفصیلات بتانی چاہئے تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پہ سوال نکالکر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرہ میں ڈالتا ہے۔ (یہودیوں نے ایسا ہی کیا) جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے

کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اپنے مطالب کو خود ہی واضح طور پر بیان کر دیا ہے یا یہ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے خارجی ذرائع کا محتاج ہے۔ اس باب میں مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:-

آپ کی تشفی کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کیلئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت اپریل و مئی ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۰۲)

اسی ضمن میں مودودی صاحب کے رفیق اور جماعت اسلامی کے بہت بڑے رکن امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:-

قرآن کے اندر اسرار حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے الفاظ و ارشادات ہیں قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر و استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔　　(ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۲۴)

قرآن کو سمجھنے کیلئے حدیث کی ضرورت نہیں

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کے سمجھنے کیلئے حدیث کی بھی ضرورت ہے یا نہیں؟ مودودی صاحب اس باب میں تحریر فرماتے ہیں۔

قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ (تنقیحات صفحہ ۱۱۶)

وہ اسی ضمن میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

قرآن کیلئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں کہ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ (تنقیحات صفحہ ۱۹۳)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) دین کے تمام اصول قرآن کریم کے اندر موجود ہیں۔

(۲) انسانوں کیلئے جائز و ناجائز کے قانون دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے یہ سمجھنا کہ کسی اور کو بھی ایسا اختیار حاصل ہے شرک ہے۔

(۳) جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے خود متعین نہیں کیں ایسا ہوا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی طرح دانستہ چھوڑا ہے۔ اب یہ کوشش کہ ان نامتعین جزئیات کو کسی نہ کسی طرح متعین بنا کر قیامت تک کیلئے غیر متبدل قرار دیدیا جائے یہودیوں کی پیروی ہے جس سے خدا اور اس کے رسول دونوں نے منع کیا ہے۔

(۴) قرآن کی تعلیم بالکل واضح اور صاف ہے۔ وہ اپنے مفہوم کے تعین کے لئے کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں نہ تفاسیر کا اور نہ احادیث کے ذخیروں کا۔

طلوعِ اسلام نے آجتک جو کچھ قرآن کریم کے متعلق لکھا ہے اسے سامنے رکھئے اور جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے اسے ایک مرتبہ پھر پڑھ ڈالئے اور اس کے بعد یہ سوچئے کہ طلوعِ اسلام کے مسلک اور مودودی صاحب کے مسلک میں ذرا بھی فرق ہے؟

دین کی جزئیات

اب آگے بڑھئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنی اصولوں کی جو جزئیات رسول اللہ صلعم نے متعین فرمائیں، کیا وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہیں گی یا ان میں بھی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے؟ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ نبی اکرم صلعم نے یہ جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر متعین فرمائی تھیں اگر بعد کے زمانے کے تقاضے ان میں کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں تو قرآنی نظام حکومت جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہو وہ ان میں ضروری تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو جسقدر ہنگامہ آرائی پیدا کی جا رہی ہے وہ بیشتر طلوعِ اسلام کے اسی مسلک کی بنا پر ہے اب دیکھئے کہ مودودی صاحب جن کی جماعت اس ہنگامہ آرائی میں پیش پیش ہے اس باب میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ تفہیمات حصہ دوم ص۳۴ پر لکھتے ہیں:

> یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لیکر اپنے احکام کی بجا آوری کیلئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں، لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو بجنسہٖ تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ . . . . پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

آپ نے غور کیا کہ مودودی صاحب کس قدر واضح الفاظ میں یہ بتلاتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم نے دین کی جو جزئیات متعین فرمائیں وہ اس خاص زمانہ کے حالات کے مطابق تھیں۔ اب تغیرِ حالات سے ان میں مناسب تغیر و تبدل کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" میں ایک مجدد کے فرائض کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اس کا کام اجتہاد فی الدین بھی ہوگا۔

یعنی دین کے اصول کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقاء تمدن کی سمت کا اسلامی نکتۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ اصول شرع کے تحت تمدن کے پرانے متوارث نقشہ میں کس طرح ردو بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے اس کے مقاصد پورے ہوں اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۴۱ء وجنوری ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۹)

مودودی صاحب نے اپنے مضمون "نشانِ راہ" میں اسی اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اسوقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کرکے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں، ان کے نزدیک سلفِ صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ ــــ تمدن وحضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل منجمد (Foscilised) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کرکے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے در حقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے "آثارِ قدیمہ" بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں، وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر وارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے۔ جو تغیر وارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان ومکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے، ہم کو "خیر امۃ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (Rearguard) کی حیثیت میں لگے رہیں بلکہ ہمارا کام امامت ورہنمائی ہے ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر امۃ" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہئے یہ ہے کہ انھوں نے قوانین طبعی کو قوانین شرعی کے تحت کرکے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا، ان کے عہد میں جو تمدن تھا انھوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی ــــ پس نبی واصحاب نبی کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانین طبعی کے انکشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔

(نشانِ راہ صفحہ ۵۵)

آپ غور کیجئے کہ کیا اس باب میں مودودی صاحب کا مسلک اس مسلک سے ذرا بھی مختلف ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ طلوع اسلام کو منکر حدیث اور اپنے آپ کو متبع سنت قرار دیتے ہیں۔

نو پیش آمدہ امور

اب رہے وہ امور جو پہلی دفعہ ہمارے سامنے آئیں سو ان کے متعلق مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جزئیات کے متعلق صریح شرعی احکام ہم کو صرف انہی حوادث اور انہی امور کے متعلق معلوم ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ کے عہد میں پیش آئے تھے۔ باقی رہے وہ حوادث جو حضور کے بعد پیش آئے تو ان کے متعلق شرع میں کوئی صریح حکم نہیں مل سکتا بلکہ صرف اصول و کلیات شرع ہی سے ایک حکم نکالا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ مجتہدین نے بعد کے حوادث پر جتنے شرعی احکام لگائے ہیں وہ اسی طرح اصول و کلیات سے اخذ کئے ہوئے ہیں نہ کہ منصوص۔ اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہۃً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثہ اور ایسی ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جس طرح صحابہ اور ائمہ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔ (تفہیمات حصہ دوم ص۳۸۵)

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) جن اصولوں کی جزئیات رسول اللہ یا صحابہؓ کے عہد میں متعین ہو گئی تھیں ان میں تغیر حال کے ساتھ ساتھ تغیر کیا جائیگا اور

(۲) جو نئے حوادث پیش آئینگے ان کے متعلق دین کے اصولوں کی روشنی میں نئے احکام مستنبط کئے جائیں گے۔

رسول اللہ کی مختلف حیثیتیں

مندرجہ صدر اصول سے درحقیقت ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا رسول اللہ کا ہر ارشاد رسول کی حیثیت ہی سے تھا یا رسالت سے الگ رسول کی کوئی دوسری حیثیت بھی تھی۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی ایک حیثیت رسالت کی تھی۔ اس حیثیت میں وہ خدا کے احکام بندوں تک پہنچاتے تھے۔ اس میں نہ وہ کسی سے مشورہ لے سکتے تھے اور نہ ہی اس میں اپنے ذاتی خیال، قیاس، رائے یا اجتہاد کا کوئی دخل ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی رسالت قیامت تک کے لئے زندہ اور پائندہ ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ رسول اللہ صلعم کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی۔ انھوں نے قرآن کے متعین کردہ نظام کو عملاً متشکل فرمایا۔ اس نظام میں آپ کی حیثیت امیر ملت کی تھی۔ اس حیثیت میں آپ مختلف امور میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اجتہاد سے کام لیتے تھے اور صحابہؓ سے مشورے بھی فرماتے تھے اور اس طرح دین کے اصولوں کی جزئیات متعین ہوتی تھیں۔ ان جزئیات میں خود خلافت راشدہ کے زمانہ میں عند الضرورت تغیر و تبدل ہوتا رہا اور اس کے بعد قرآنی نظام مملکت کو اس کی اجازت ہے کہ وہ تغیر حالات کے ساتھ ان جزئیات میں تغیر کرتے رہیں۔

اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلعم کی ان دو حیثیتوں کے متعلق مودودی صاحب کا کیا عقیدہ ہے۔ وہ تفہیمات جلد اول میں لکھتے ہیں :-

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبیؐ کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ نبیؐ وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا ذاتی حق حاصل ہے۔ . . . . . اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے جو اصل ایمان ہے اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یکسر انحراف کا بھی حق نہیں۔ وہ دراصل نبی بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبیؐ کی اطاعت ہے۔ اس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی، اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ (ص ۸۹-۹۲)

اسی طرح وہ "رسائل و مسائل" میں لکھتے ہیں :-

دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ . . . . . تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کیلئے نبی صلعم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کیلئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مزاج اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کیلئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (ص ۳۱۱-۳۱۷)

آپ نے دیکھا کہ یہاں کیسے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایک تو وہ اصول تھے جنہیں جاری کرنے کیلئے رسول اللہ تشریف لائے اور دوسری وہ عملی شکل تھی جن کی رُو سے رسول اللہ نے ان اصولوں کو جاری فرمایا۔ وہ اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی عملی صورتیں جو اس زمانہ کے حالات اور طرز معاشرت کو پیش نظر رکھ کر اختیار کی گئی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے واجب الاتباع اور غیر متبدل نہیں ہیں۔ یہی نہیں کہ یہ چیزیں واجب الاتباع نہیں بلکہ مودودی صاحب تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ

اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے۔ جس سے بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (رسائل و مسائل ص ۳۰۸)

طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ دین کے جو اصول قرآن میں دیئے گئے ہیں ان کی عملی جزئیات متعین کرنے کیلئے رسول اللہ صلعم صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے لہٰذا یہ جزئیات بربنائے وحی نہ تھیں۔ جو بات مشورہ سے طے ہو وہ مشورہ سے بدلی بھی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ کی چیثیت امیر ملت کی حیثیت تھی اسلئے قرآنی نظام مملکت میں امیر ملت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے تقاضائے حالات کے

مطابق ان جزئیات میں تغیر و تبدل کرلے۔ اس نقطہ کے متعلق کہ رسول اللہ صلعم کو بحیثیت امیر مملکت مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

قرآن کہتا ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی سے انجام پانے چاہئیں اور نبی صلعم کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ پھر مشورہ کے بعد جب تم عزم کرلو تو اللہ کے بھروسہ پر عمل کرو۔ (ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۰۰)

اللہ و رسول کی اطاعت سے قرآن کی مراد

طلوع اسلام کا کہنا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں "اللہ اور رسول کی اطاعت" کا حکم دیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اطاعت اس نظام کی ہے جو قرآنی قوانین کو نافذ کرے اور "اللہ اور رسول کی نافرمانی" اس نظام کی نافرمانی ہے۔ اب دیکھئے کہ مودودی صاحب اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا . . . . . مودودی صاحب اس کا ترجمہ لکھتے ہیں "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں" یہاں اللہ اور رسول سے کیا مراد ہے اس کی بابت وہ لکھتے ہیں:۔

خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ (تفہیم القرآن صفحہ ۴۶۵)

آپ نے دیکھا کہ "اللہ اور رسول" سے مراد مودودی صاحب کے نزدیک بھی اسلامی نظام حکومت ہے۔

احادیث

احادیث کے متعلق طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جسقدر وحی نازل ہوئی وہ سب قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلعم نے جو کچھ فرمایا وہ حضور کے اپنے ارشادات تھے، کلام اللہ نہیں تھا۔ اس بارہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اسقدر مختلف اسٹائل کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں، ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اسقدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہوسکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۸۵)

رسائل و مسائل میں دجال سے متعلق احادیث پر بحث کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپؐ کے قیاسات ہیں جن کے بارہ میں آپ خود شک

ہیں تھے ..... یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کیلئے ہم مکلف کئے گئے ہوں۔ (ص ۵۵-۵۶)

یہ تو رہی مودودی صاحب کے نزدیک حدیث کی حقیقت۔ اب سوال یہ ہے کہ جو حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں کیا ان سے دین کے متعلق کوئی یقینی علم بھی حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جاوے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسولؐ انھیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔ (رسائل و مسائل ص ۶۷)

یہ بعینہ وہی چیز ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

قول رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ برخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلعم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (رسائل و مسائل ص ۲۷)

طلوع اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ ہم احادیث کے موجودہ مجموعوں کے متعلق یقین کے ساتھ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ جن چیزوں کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل رسول اللہؐ کی ہیں بھی یا نہیں اس لئے یہ چیزیں دین کا مدار قرار نہیں پا سکتیں کیونکہ دین کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہدیا ہے کہ اسے لاریب فیہ ہونا چاہئے یعنی ایسا کہ جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

اسی طرح مودودی صاحب، ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اسکی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۲۹)

اس چیز کا فیصلہ کہ کونسی حدیث رسول اللہؐ کی ہو سکتی ہے اور کونسی نہیں، مودودی صاحب کے نزدیک اس شخص کی ذاتی بصیرت ہے جو "مزاج شناس رسالتمآبؐ ہو" لیکن اس کے متعلق وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ یہ چیز کسی دوسرے شخص کیلئے سند نہیں قرار پا سکتی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جسکو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جسکو شرعی کہتی ہے، وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے (تفہیمات حصہ دوم ص ۳۳۱)

اسی بنا پر طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی چیز شرعی ہے اور کونسی شرعی نہیں صرف مسلمانوں کا اسلامی نظام کر سکتا ہے۔ مودودی صاحب اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی بخاری شریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں اُن کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن اکتوبر و نومبر ۵۲ء ص ۱۱۷)

آپ مندرجہ صدر اقتباسات کو غور سے دیکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ حدیث کے متعلق جو مسلک طلوع اسلام پیش کرتا ہے اس میں اور مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک میں کوئی بھی فرق ہے؟ لیکن اس کے باوجود یہی مودودی صاحب ہیں کہ وہ طلوع اسلام کو منکرِ حدیث قرار دیکر اسے (معاذ اللہ) خدا اور رسول کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں اور خود سب سے بڑے متبعِ سنت بن کر خدا اور رسولؐ کے اطاعت گذار بنتے ہیں۔ دنیا میں اس قسم کی دیدہ دلیریاں کم ہی دیکھنے میں آئی ہوں گی۔

امیر جماعت اسلامی کی تضاد بیانیاں

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب اس باب میں طلوع اسلام اور مودودی صاحب کا مسلک ایک ہی ہے تو پھر ان دونوں میں فرق کہاں پیدا ہوتا ہے؟ فرق پیدا ہوتا ہے اس باب میں کہ طلوع اسلام جو کچھ ایک جگہ کہتا ہے وہی کچھ دوسری جگہ کہتا ہے۔ آج جو کہتا ہے وہی کل کہتا ہے لیکن مودودی صاحب کا یہ حال ہے کہ وہ ہر مقام پر موقعہ اور مصلحت کے لحاظ سے الگ الگ بات کہتے ہیں۔ آج کچھ، کل کچھ، یہاں کچھ، وہاں کچھ، ممکن ہے کہ آپ کو اس پر تعجب ہو اور مودودی صاحب کے متبعین کو اس پر غصہ بھی آئے لیکن طلوع اسلام جو کچھ کہتا ہے دلیل اور سند کے ساتھ کہتا ہے یونہی کسی کے خلاف الزام عائد نہیں کر دیتا۔ جو کچھ اس نے کہا ہے اس کا ثبوت لیجئے اور دیکھئے کہ مودودی صاحب کس قدر متضاد باتیں کہتے چلے جاتے ہیں۔

رسول اللہ کی دو حیثیتیں

حدیث کے معاملہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلعم کی ایک ہی حیثیت (رسالت کی) تھی یا دو الگ الگ حیثیتیں تھیں۔ علامہ اسلم جیراجپوری نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں تحریر فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کی دو الگ الگ حیثیتیں تھیں ایک حیثیت رسالت جس میں آپ خدا کی وحی انسانوں تک پہنچاتے تھے اور دوسری حیثیت بشری جس میں آپ اپنی ذاتی حیثیت سے معاملات سرانجام دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا

> یہ تفریق جو انھوں نے محمد ابن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے قرآن میں آنحضرت صلعم کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے، جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا . . . اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا . . . . حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ (تفہیمات حصہ اول ص ۲۳۱)

اس کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مودودی صاحب پر لوگوں نے اعتراض کر دیا کہ ان کی ڈاڑھی سنت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلعم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا ۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انھیں سنت بنا لینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا ۔ یہ دین میں تحریف ہے ۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۳۱۱—۳۰۰)

آپ نے غور فرمایا کہ جب علامہ اسلم صاحب نے یہ لکھا کہ رسول اللہ صلعم کی ایک حیثیت رسالت کی تھی اور ایک بشریت کی تو مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ غلط ہے رسول اللہ کی ایک ہی حیثیت تھی ۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا ۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے ۔ لیکن جب خود مودودی صاحب پر اعتراض ہوا کہ ان کی ڈاڑھی سنت کے مطابق نہیں تو انھوں نے فرما دیا کہ رسول اللہ کا یہ حکم یا عمل انسان کی حیثیت سے تھا رسول کی حیثیت سے نہیں تھا اسلئے یہ سنت میں داخل ہی نہیں ۔ یہیں تک ہی نہیں انھوں نے علامہ جیراجپوری کے جواب میں کہا تھا کہ

"قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں کہ رسول کی دو حیثیتیں تھیں" لیکن

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو وہ نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو، البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے ۔ (تفہیمات حصہ اول صفحہ ۸۹)

یعنی ایک جگہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں کہ رسول اللہ کی دو حیثیتیں تھیں اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے کہ رسول کی دو حیثیتیں ہیں یعنی جب ضرورت پڑی تو کہدیا کہ قرآن سے یہ ہرگز ہرگز ثابت نہیں اور جب دوسرے وقت پر موقعہ آیا تو کہدیا کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ رسول کی دو حیثیتیں تھیں ۔ ظاہر ہے کہ یا تو یہ چیز قرآن سے پہلے درجے کی جہالت ہے اور یا بدترین قسم کا مذاق ۔ بہر حال صورت کچھ بھی ہو موقعہ اور محل کے لئے دونوں قسم کی باتیں قرآن کی طرف منسوب کر دی گئیں ۔ اس قسم کا کھلا ہوا تضاد تو شاید مرزا غلام احمد کے ہاں بھی نہ ملے ۔

اور آگے بڑھئے :-

تمام وحی قرآن میں محفوظ ہے

علامہ اسلم جیراجپوری نے لکھا تھا کہ رسول اللہ پر جو وحی نازل ہوئی تھی وہ سب قرآن میں محفوظ ہے قرآن سے باہر وحی نہیں ہے ۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ کتاب کے سوا اور کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہو وحی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے ۔ (تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۴۲—۲۴۴)

اس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک وحی کا کچھ قرآن میں داخل ہے اور کچھ احادیث میں ۔ یہ دوسرا حصہ بھی قرآن کی طرح

(مثلہ معہ) خدا کی طرف سے ہوتا تھا خود رسول کا اپنا کلام نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہی مودودی صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اسقدر مختلف اسٹائل کبھی ہو نہیں سکتے ..... آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں جن کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اسقدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔ (ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۸۵)

یعنی ایک جگہ کہا گیا کہ احادیث بھی اسی طرح سے خدا کی طرف سے وحی ہیں جس طرح قرآن کریم خدا کی طرف سے وحی ہے لیکن دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قرآن اور حدیث کے اسلوب اور انداز سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ احادیث اس خدا کا کلام نہیں جس کا کلام قرآن ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ یہ کسقدر کھلا ہوا تضاد ہے۔

بات صرف اسلوب و انداز تک ہی محدود نہیں اس سے آگے بھی ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ

ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے وحی ہوگی ..... اور آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول ہونے کی حیثیت سے تھا۔

لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے کہ

ان امور کے متعلق جو باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارہ میں آپ خود شک میں تھے ..... یہ باتیں آپ نے علم وحی کے مطابق نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۵۵-۵۶)

یعنی ایک جگہ یہ کہا گیا کہ رسول کا ہر قول وحی سے تھا اور منجانب اللہ تھا اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ یہ احادیث رسول اللہ کے قیاسات تھے جن میں آپ کو خود بھی شک تھا۔

ذرا سوچئے کہ اس قسم کی کھلی ہوئی متضاد باتیں کس قسم کا انسان کر سکتا ہے۔

رسول اللہ کو بحیثیت امیر کے امت سے مشورہ کا حکم

اور آگے بڑھئے۔ علامہ اسلم جیراجپوری نے لکھا کہ رسول اللہ کو بحیثیت امیر خدا کی طرف سے حکم تھا کہ آپ امت سے مشورہ کیا کریں۔ اس پر مودودی صاحب نے فرمایا کہ

اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امرا کی سی ہے۔ دوسرے امرا کیلئے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں وامرھم شوریٰ بینھم لیکن رسول اللہ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام کریں (فاذا عزمت فتوکل علی اللہ) آپ کی امارت آپ کی رسالت سے الگ نہ تھی بلکہ آپ رسول خدا ہونے کی حیثیت ہی سے امیر تھے۔ (تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۴۴)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک رسول اللہ کی امارت کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی۔ آپ کو مشاورت کا جو حکم دیا گیا تھا وہ بحیثیت امیر ریاست نہیں تھا بلکہ بحیثیت رسول ہی تھا قرآن کی آیت وامرھم شوریٰ بینھم عام امرا کے لئے تھی اور فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کا حکم رسول اللہ کے لئے خاص تھا۔ لیکن دوسری جگہ مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورہ سے انجام پانے چاہئیں وامرھم شوریٰ بینھم اور نبی اکرم صلعم کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ پھر مشورہ کے بعد جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسہ پر عمل کرو۔ یہ دونوں آیتیں مشورہ کو لازم کرتی ہیں اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورہ کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسہ پر اسے نافذ کرے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۰۰)

آپ نے غور کیا کہ ایک جگہ یہ فرمایا گیا کہ مشورہ کی ایک آیت (وامرھم شوریٰ بینھم) تو عام امراء کے لئے تھی اور دوسری آیت (فاذا عزمت فتوکل علی اللہ) رسول اللہ کے لئے۔ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے کہ یہ دونوں آیتیں مشورہ کو لازم کرتی ہیں اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورہ کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسہ پر اسے نافذ کرے۔ یعنی جب علامہ اسلم پر اعتراض کیا تو کہدیا کہ رسول اللہ کے لئے یہ خاص حکم تھا کہ جب آپ کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں تو اسے اللہ کے بھروسہ پر نافذ کر دیں لیکن جب کراچی کے وکلاء کی محفل میں تقریر کی تو اس وقت یہ فرمادیا کہ یہ آیت ہر صدر ریاست کے لئے ہے۔ اس قسم کا تلاعب بالدین بھی کم ہی دیکھنے میں آیا ہوگا۔

حرام اور حلال

دین میں حرام اور حلال کا سوال بڑا بنیادی ہے۔ اسی سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ حرام صرف وہی چیزیں ہیں جنھیں قرآن نے حرام قرار دیدیا ہے یا وہ چیزیں بھی جنھیں روایات میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ سید محمد صبیح صاحب نے حلال و حرام کی تحقیق پر ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے بتایا کہ قرآن نے صرف چار[1] چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے (ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۵۸) میں بڑے طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ

> اس میں تحقیق یہ پیش کی گئی ہے کہ قرآن میں صرف مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونیوالے جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے لہٰذا درندے، کتے، گدھے، مینڈک، چوہے وغیرہ سب حلال ہیں۔ . . . . . کتاب کے مباحث، طرز استدلال اور انداز بیان سب منکرین حدیث حضرات کے پیٹنٹ ہیں۔

یعنی یہ مسلک منکرین حدیث کا ہے کہ حلال اور حرام صرف کتاب اللہ میں ہے۔ ورنہ متبعین حدیث کا مسلک یہ ہے کہ جن چیزوں کو احادیث میں حرام بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی طرح حرام ہیں۔

ترجمان القرآن میں تو یہ لکھا ہے لیکن مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ

---

[1] طلوع اسلام میں اس کتاب پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے جس میں صبیح صاحب کے اس خیال سے اختلاف کیا گیا ہے کہ جس چیز کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے اس کا کھانا بہر حال فرض ہے۔ حلال کے ساتھ طیب کے قرآنی اضافے نے یہ بتادیا کہ وہ حلال چیزیں کھائی جائیں گی جو خوشگوار بھی ہوں اور جن سے طبیعت کو کراہت نہ آتی ہو۔

فقہائے اسلام میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حیوانی غذاؤں میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں (یعنی مردار، بہتا ہوا خون، سور کا گوشت یا جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے) اور ان کے سوا ہر چیز کا کھانا جائز ہے۔ یہی مسلک حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا تھا۔ . . . . . . ان تمام مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ دراصل شریعت الٰہی میں قطعی حرمت ان چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ (ص ۵۹۲-۵۹۳)

یعنی ایک جگہ یہ لکھا جاتا ہے کہ شریعت میں یہی چار چیزیں قطعی طور پر حرام ہیں۔ فقہائے اسلام کے ایک گروہ کا بھی یہی عقیدہ ہے اور یہی مسلک حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا بھی تھا۔ لیکن جب یہی بات محمد صبیح صاحب لکھتے ہیں تو ان کا یہ کہہ کر مذاق اُڑایا جاتا ہے کہ یہ منکرین حدیث کی باتیں ہیں۔ یعنی وہی بات جب مودودی صاحب کہیں تو وہ اطاعت خدا بھی ہوا اور اتباع سنت بھی۔ مشرب فقہا بھی ہوا اور مسلک صحابہ بھی۔ لیکن جب وہی بات کوئی فریق مخالف کہے تو منکر حدیث قرار پائے۔

میں جو چپ بیٹھوں سڑی کہلاؤں
شیخ چپ بیٹھے توکّل ٹھہرے

(حرام اور حلال کے متعلق مودودی صاحب کی اس تفسیر میں بھی ایسی متضاد باتیں لکھی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر انسان حیرت میں رہ جاتا ہے لیکن ان کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں)

اسلاف پر تنقید

طلوع اسلام کے خلاف سب سے بڑا جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ یہ ان معتقدات و رسومات پر تنقید کرتا ہے جو ہمارے اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ لیکن ان ہی اسلاف کے متعلق مودودی صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔ مثلاً

بلاشبہ یہ قول حسن بصری اور قتادہ اور اعمش وغیرہم سے منقول ہے مگر یہ لوگ خدا کی طرف سے کب مبعوث ہوئے تھے کہ ان کے اقوال کو ترک کر دینے سے انسان کافر ہو جائے . . . . . . یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہو . . . . . . مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تنقیحات ص ۱۳۲-۱۴۰-۱۴۱)

غور کیجئے کہ یہ لفظاً لفظاً وہی بات نہیں جو طلوع اسلام کہتا ہے لیکن اس کے باوجود طلوع اسلام اسلاف کا منکر اور یہ حضرات اسلاف کے نام لیوا ہیں۔

کیا تمام امت منافق تھی؟

طلوع اسلام نے اتنی سی بات کہدی کہ قرآن کریم نے قربانی کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اس کا مقام کعبہ ہے اور یہ جو ہم ہر شہر اور ہر قریہ میں قربانیاں دیتے ہیں یا حج کے موقعہ پر جانور کاٹ کر

یوں ہی پھینک دیتے ہیں اس کی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ اس کے خلاف مودودی صاحب غیظ و غضب کی ایک پوری دنیا اپنے جلو میں لئے ہوئے اٹھے اور گرجتے ہوئے فرمایا کہ

آخر یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے کہ حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسول خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے۔

(تفہیمات حصہ دوم ص۲۱۱)

لیکن انہی مودودی صاحب نے جب اپنی مجددیت کا مہرہ آگے بڑھایا ہے تو اس کی تمہید یوں شروع کی کہ حضرت عثمانؓ کے عہد ہی میں "جاہلیت" کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستہ سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لئے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگان اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں۔ پرانے معبدوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء ص۲۸۴-۲۸۵)

کوئی ان صاحب سے پوچھے کہ کیا یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر مشتمل تھی کہ اس قسم کے مشرکانہ تصورات، معتقدات، اور رسومات اسلام میں داخل ہوتے گئے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کرتی رہی۔ اگر مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق امت نے اس قسم کی مشرکانہ عبادات و اعمال کو قبول کر لیا تھا تو کیا اس کا امکان نہ تھا کہ یہ امت قربانی کی رسم کو بھی اپنے ہاں رائج کر لیتی۔

لیکن طلوع اسلام اگر قربانی کی رسم کے متعلق اتنا سا کہدے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ دیکھو یہ امت کو منافق قرار دے رہا ہے لیکن اگر مودودی صاحب پوری امت کے متعلق یہ ارشاد فرمائیں کہ وہ مشرکانہ تصورات و عادات کو ایک ایک کر کے قبول کرتی گئی تو وہ بدستور مجدد کے مجدد رہیں۔

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

غرضیکہ کہاں تک لکھتے جائیے۔ ہم اگر چاہیں تو مودودی صاحب کے اسی قسم کے تضادات کی ایک تصنیف پیش کر سکتے ہیں لیکن اس کی سردست ضرورت نہیں۔ آپ نے اتنے اقتباسات سے ہی یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ صاحب کس طرح دین کے سے اہم معاملہ میں بھی مختلف مواقع پر متضاد باتیں کہتے چلے جاتے ہیں۔ اور انھیں کوئی نہیں پوچھتا کہ دین سے ایسا مذاق کیوں ہو رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک تو عوام کا حافظہ ہی کمزور ہوتا ہے۔ دوسرے جب انسان اپنے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ قائم کر لے تو پھر کوئی شخص تنقید کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد جو آپ کے جی میں آئے کہتے چلے جائیے۔ ہر طرف سے سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں وجہ فریب نفس بنتی چلی جائیں گی۔ لیکن

آپ سوچئے کہ اپنے تھوڑے سے فائدہ کے لئے کتنا بڑا نقصان ہے جو سادہ لوح مسلمانوں کو پہنچایا جاتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ یہ مقالہ اس وقت شائع ہو رہا ہے جبکہ مودودی صاحب گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے یہ کہا جائے کہ جب وہ اس پوزیشن ہی میں نہیں کہ اس کا جواب دے سکیں تو وہ اپنی مدافعت کس طرح کر سکتے ہیں۔ لیکن قارئین کو یاد ہو گا کہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء میں آج تک اس کی جرأت و ہمت نہیں ہوئی کہ وہ طلوع اسلام کے کسی اعتراض کا بھی جواب دے سکیں اگرچہ وہ اپنی اس کمزوری اور عجز کو ہمیشہ اس پندار کے نقاب میں چھپاتے رہے ہیں کہ ہم ایسے "ذلیل لوگوں" کے منہ نہیں لگنا چاہتے۔ اس لئے اگر وہ باہر بھی ہوتے تو وہ ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ ہم نے اس مقالہ کو اسلئے شائع کیا ہے کہ جو سادہ لوح مسلمان نہایت دیانتداری سے یہ سمجھ کر ان حضرات کے ساتھ شامل ہیں کہ یہ بہت بڑے متبع سنت اور اسلاف کے عقیدتمند ہیں اُن پر ان کی اصلی حقیقت آشکارا ہو جائے اور وہ کسی دھوکہ میں نہ رہیں۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے جواب میں جماعت اسلامی کی طرف سے یہ کہا جائے گا (جیسا کہ یہ اکثر کہا کرتے ہیں) کہ مودودی صاحب کی عبارات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور اقتباسات بھی صحیح نہیں دیئے جاتے۔ ہم آپ سے صرف اتنا کہیں گے کہ جو شخص یہ بات کہے اس سے کہئے کہ ہم نے جو حوالے اوپر دیئے ہیں وہ کتابیں لے آئے اور اس کے بعد آپ کو بتائے کہ کہاں الفاظ کو توڑا مروڑا گیا ہے اور کہاں اقتباسات کو غلط پیش کیا گیا ہے۔ آپ اس کا شدت سے مطالبہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

مئی ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ ماہ جون ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ مئی ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ مئی سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلے سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہو گا۔ فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا ہے۔

۱۵ — ۲۱ — ۲۳ — ۵۴ — ۸۰ — ۳۰۶ — ۳۳۰ — ۳۶۴ — ۳۷۰ — ۴۹۸ — ۵۰۰ — ۵۰۷ — ۵۱۷ — ۵۱۸ — ۵۶۷
۸۹۲ — ۸۹۹ — ۹۰۰ — ۹۰۱ — ۹۰۲ — ۹۰۴ — ۹۲۷ — ۹۲۸ — ۹۲۹ — ۹۳۰ — ۹۳۲ — ۹۳۳
۹۳۴ — ۹۳۵ — ۹۴۰ — ۹۴۱ — ۹۴۲ — ۹۴۳ — ۹۴۵ — ۹۵۴ — ۹۵۶ — ۹۶۲ — ۹۶۳ — ۹۷۵
۱۱۰۶ — ۱۱۰۷ —

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

شروع مارچ میں کراچی کے در و دیوار پر یہ اشتہار چسپاں تھا

مطالبات

فرقۂ دیوبندیہ کو علیحدہ اقلیتی فرقہ تسلیم کیا جائے

چند علماء کی مجلسِ شوریٰ کے وضع شدہ "اسلامی حکومت کے بنیادی اصول" نظر سے گذرے جس کی دفعہ ۹ میں اسلامی فرقوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان کی تفصیل ندارد۔ بظاہر اس نظر اندازی کی وجہ دورِ برطانیہ کے پیدائشی اقلیتی فرقہ کی تخلیقی و سیاسی اغراض کی تکمیل اور اس کو پاکستان کے اکثریتی فرقہ میں مدغم دکھا کر اس کے ہاتھوں اکثریت کے عقائد پائمال کرانا معلوم ہوتی ہے اس لئے ہم کھلے الفاظ میں حکومتِ پاکستان پر یہ واضح کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ خدام اولیاء اللہ یعنی اہل سنت والجماعت فرقہ پاکستان کی اکثریت ہے جو مذہب اور مسلک آج اس کا ہے، وہی عہدِ شہاب الدین غوری سے تا شاہِ عالم بادشاہ دہلی مملکتِ اسلامیہ "غیر منقسم" ہند کا مذہب و مسلک رہا ہے ——

پاکستان کے اس مسلم اکثریت کے عقائد ہیں:۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب اور آداب۔ تعین کے ساتھ ایصال ثواب۔ معینہ تاریخوں پر نذر و نیاز۔ بزرگانِ اسلام کے مقررہ تاریخوں میں اعراس۔ محافل میلاد اور اس میں قیام کے ساتھ صلوٰۃ وسلام۔ وغیرہ وغیرہ داخل ہیں۔

لیکن دورِ برطانیہ کا پیدائشی اقلیتی فرقہ اکثریت کے مذکورہ بالا معتقدات کو شرک اور بدعت قرار دیتا ہے اور سمجھتا ہے اور ابتداءً جو پابندیاں ابن سعود کی جانب سے معتقداتِ قدیمہ کی بجا آوری پر عائد تھیں ویسی پابندیاں اکثریت کے عقائد بالا کی بجا آوری پر یہ اقلیتی فرقہ بھارت اور پاکستان میں عائد کرنا جائز سمجھتا ہے۔ اس اقلیتی فرقہ کی تخلیق ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدِ حکومت میں ہوئی اور اس کے بانی مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی تھے جنہوں نے انگریزوں پر جہاد ناجائز قرار دیا مگر انگریزوں کے ایما سے سکھوں پر جہاد فرمایا اور امکانِ کذب اور امکان نظیر نعوذ باللہ خدا کے جھوٹ بولنے اور رسولؐ کے مثل پیدا ہونے کے خود تراشیدہ عقائد وضع فرمائے۔

۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کے سامنے ہندوستان کو عیسائی بنانے کی جو اسکیم پیش کی گئی تھی اس کی ایک دفعہ یہ ہے: "ہندوستان کے بت پرستوں" یعنی غیر عیسائیوں" کو ان کے سیاسی اور مذہبی میلوں میں جمع نہ ہونے دو"۔

اس اسکیم کے بعد مولوی اسمٰعیل صاحب کے معطلہ مشن میں نئی روح داخل ہوئی اور ان کے وضع کردہ عقائد اور حدود و خطوط پر قصبہ دیوبند

میں ان کے قائم کردہ فرقہ کی تشکیل جدید عمل میں آئی " بدیں وجہ " اب وہ دیوبندی فرقہ کے نام سے موسوم ہیں مگر یہ فرقہ تعداد میں کم ہے اس لئے خود کو اہل سنت والجماعت میں داخل کہتا ہے حالانکہ اس کے عقائد اہل سنت والجماعت سے قطعی جدا ہیں یعنی جس طرح سکھ ہندوؤں سے نکلے مگر ہندو نہیں ہیں۔ یا انگلینڈ کے پروٹسٹنٹ رومن کیتھولک سے نکلے مگر رومن نہیں، اسی طرح دیوبندی فرقہ اہل سنت والجماعت سے نکلا مگر اہل سنت والجماعت نہیں۔ اقلیتی فرقہ دیوبندیہ کے نمائندگان خصوصی مفتی محمد شفیع صاحب۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، مولوی احتشام الحق صاحب، مسٹر ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہم ہیں۔ مگر اکثریت کے عقائد اور اس کے حقوق کی نظر اندازی اصول جمہوریت کے توہین کے مترادف ہے اس لئے اکثریت کی جانب سے حسب ذیل مطالبات پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جمہوریہ پاکستان کے امیر کے مسلمان ہونے کی دفعہ میں اس کا اکثریت کا ہم عقیدہ ہونا لازمی شرط قرار دیا جائے۔

۲۔ اہلسنت والجماعت سے دیوبندی فرقہ کو علیحدہ فرقہ تسلیم کیا جائے۔

۳۔ دیوبندی فرقہ کی اہلسنت والجماعت کے معتقدات اور اوقاف میں مداخلت قانوناً ممنوع قرار دی جائے۔

ان مطالبات کا مقصد پاکستان میں فرقہ بندی کو ہوا دینا نہیں بلکہ ان کا مقصد پاکستان سے ہمیشہ کیلئے فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرانا اور اکثریت کا تحفظ واظہار نفس الامری۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہنری ہشتم کے عہد حکومت میں بعض چلتے پرزے پروٹسٹنٹ پادریوں نے خود کو رومن ظاہر کرتے ہوئے اور رومن مذہب کی ترقی کیلئے حکومتِ الٰہیہ اور نظام عیسوی کے نعرے بلند فرما کر ہی پارلیمنٹ کے ذریعے رومن کیتھولک مذہب کو " انگلینڈ کی سرزمین سے ختم کرایا تھا " اگر اہل سنت والجماعت کے سر پر دیوبندی فرقہ کو مسلط کیا گیا تو اس کے معنی ہنری ہشتم اور رومن کیتھولک کی تجدید کے ہوں گے۔ الداعیان الی الخیر

حضرت مولانا مخدوم سید ناصر جلالی (سرپرست جمعیۃ العلماء پاکستان)

(۱) (حضرت شاہ مشائخ) پیرجی عبدالرشید سجادہ نشین حضرت قلندر صاحبؒ (لاہور) (۲) (حضرت شاہ) حکیم ابن حسن جانشین حضرت علامہ حیا علیہ الرحمۃ (کراچی) (۳) (حضرت شاہ) خادم آستانہ عالیہ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ وارد حال لالوکھیت کراچی (۴) (حضرت شاہ) سید صفدر علی سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ (کراچی)۔ (۵) (حضرت شاہ) سید عبدالغنی شاہ قیصر وارثی سرپرست حسینی دواخانہ وارٹر کورس روڈ کراچی۔ (۶) (حضرت شاہ) قیصر ضیاء القادری چشتی صدر جمعیۃ المشائخ و مجلس شیدائیان نبی کراچی (۷) (حضرت شاہ) الحاج قاضی سید محبوب شاہ الحسنی عفا اللہ عنہ (قاضی شہر کراچی) (۸) (حضرت شاہ) پیرزادہ محمد شجاع الدین خادم آستانہ عالیہ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ (۹) (حضرت مولانا) فقیر حامد جلالی دہلوی (امیر جماعت جاں نثاران اسلام کراچی) (۱۰) (حضرت مولانا) ظفر الحق محمد احمد قادری غفرلہ بدایونی۔ کپڑا مارکیٹ کراچی۔ (۱۱) (حضرت مولانا) محمد مظفر احمد غفرلہ (شاہی امام مسجد فتحپوری دہلی) کراچی۔ (۱۲) (حضرت مولانا) محمد مسعود احمد جانشین حضرت مولانا کرامت اللہ خاں صاحب عفی عنہ۔ (۱۳) (حضرت مولانا) بندہ بارگاہ غوث زمن ظہور الحسن الدرس السندی القادری کراچی (۱۴) (مولانا) محمد ادریس عفی عنہ دہلوی کراچی (۱۵) (مولانا) محمد عمر امام مسجد میمن سمر سیٹ سٹریٹ کراچی۔ (۱۶) اختر حسن علی سابق مفتی ریاست بھوپال کراچی (۱۷) (مولانا) نصیر احمد بلگرامی لالوکھیت کراچی۔ (۱۸) (مولانا) شفیع اللہ خطیب مسجد جامع قائد آباد کراچی۔ (۱۹) ڈاکٹر ایم اے شکیل اشرف مدیر سہ روزہ اخبار سفینہ کراچی۔ (۲۰) (افسر الاطباء) حکیم کریم الدین اکرم دہلوی پیر الٰہی بخش کالونی کراچی۔ (۲۱) (مولانا) محمد عارفین دہلوی اسلم روڈ کراچی۔ (۲۲) محمد عثمان قریشی کونسلر مسلم لیگ دہلی۔ (۲۳) سید غلام محی الدین۔ (۲۴) سید فیاض حسین زیدی مارٹن روڈ کراچی۔ (۲۵) سید صفدر علی مارٹن کوارٹر کراچی۔ (۲۶) محمد صدیق یوسف کلاتھ مرچنٹ کراچی (۲۷) قاضی ظہور الحسن ابن سینا لائن کراچی (۲۸) ملک اسلام الدین دہلوی۔

شب بارات کی دینی حیثیت کیا ہے؟

یہ کیوں منائی جاتی ہے

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اور سوالات ہیں جن کے جواب آپ کو اس کتاب میں ملیں گے جو ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ کتاب کا موضوع ہے،

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

کاغذ پر عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے کتاب ابھی تک چھپ نہیں سکی لیکن اب امید ہے کہ عنقریب چھپ جائیگی۔ جن احباب نے اپنی فرمائشیں بھیجدی ہیں، انھیں ترتیب وار کتاب بھیجدی جائیگی۔

اگر آپ

نے ابھی تک اپنی فرمائش نہیں بھیجی تو جلدی کیجئے کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے کتاب زیادہ تعداد میں نہیں چھاپی جائیگی۔

اس کتاب کا ہر ایک گھر میں رہنا ضروری ہے

اس لئے کہ اس میں روزمرہ کی زندگی سے متعلق سینکڑوں ایسے امور آگئے ہیں جن کے متعلق ہمارا مروجہ مذہب کچھ اور کہتا ہے اور قرآن کے مطابق جن کی حقیقت کچھ اور ہے۔

کتاب چار سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ـــــ اپنی فرمائش جلدی بھیجئے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

افسوس کہ راویانِ احادیث تفسیر میں جو لوگ زیادہ پیش پیش تھے تقریباً سب کے سب ناقابلِ اعتبار اور اس جماعت میں وضاعین و کذابین کی بہت بڑی اکثریت کارفرما رہی۔ مفسرین متقدمین نے ہر آیت کے متعلق متضاد و متخالف روایتیں جھوٹی سچی ہر طرح کی حدیثیں اور ہر طرح کے اقوال جمع کر کے آیات قرآنیہ کے معانی کو مشتبہ کر دیا کہ پڑھنے والوں کو پتہ نہ ملے کہ قرآن کا اصل اور صحیح مطلب کیا ہے۔ بلکہ ہر شخص اپنی رائے کے مطابق جو حدیث جو قول دیکھے اسی کے مفہوم کو صحیح معنی قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرے۔

جب فرقہ بندیوں کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تو پھر ہر فرقے نے اپنے فرقہ وارانہ مسلک کی پشتیبانی کے لئے تفسیریں لکھنا شروع کیں اور قرآن کو اپنی مخصوص فرقہ وارانہ ذہنیت کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جیسی آسان اور سریع الفہم کتاب دشوار فہم بن کر رہ گئی اور موجودہ مفسرین و مفکرین قرآن کے حرمِ کعبہ میں یورپ کا ناقوس بجانے کی دھن میں لگے ہیں۔

بعض نے مفکرین موجودہ سیاسی کشمکش میں قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر کے اپنا مطلب نکال رہے ہیں۔ غرض جو ہے وہ قرآن کو اپنی طرف کھینچتا ہے، خود قرآن کی طرف نہیں کھنچتا۔ قرآنی آیات کو اپنی طرف لانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ خود قرآن کی طرف نہیں جاتا۔

غرض ان اگلی اور پچھلی تفسیروں کے غبار میں قرآن مبین کی ربوبیت کا آفتاب اس طرح چھپ گیا ہے کہ بس اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ دن کا وقت ہے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ظہر کا وقت ابھی باقی ہے یا عصر کا وقت شروع ہو گیا۔ فصاحت و بلاغت کے بحدِ اعجاز ہونے کے غلغلے لوگوں کے کان بھر چکے ہیں۔ اور یہ غلغلہ بھی ایک حد تک مدھم پڑ چکا ہے اور مدھم پڑتا ہی جا رہا ہے چونکہ اب اس دعوے کے جانچنے والے اور علیٰ وجہ البصیرۃ اس کو صحیح سمجھنے والے غالباً ہزار میں ایک سے زیادہ نہ ملیں گے۔ بعض پرانے خیال کے لوگ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو محض عقیدۃً معجزہ مان رہے ہیں، ورنہ بعض لوگ تو بول جاتے ہیں کہ سعدی کی گلستاں اور فردوسی کے شاہنامے کا بھی تو کسی سے جواب آج تک نہ ہو سکا۔ حالانکہ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سعدی یا فردوسی نے اپنے اپنے وقت کے اہلِ قلم کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ اگر سعدی چیلنج کرتے تو اس وقت ایسی ایسی کتنی گلستاں تیار ہو جاتیں اور اگر فردوسی چیلنج کرتے تو متعدد شاہنامے تیار ہو جاتے جس بلند آہنگی کے ساتھ قرآن مبین نے مخالفوں اور منکروں کو مقابلے کے لئے للکارا ہے اور غیرت دلائی ہے۔ اور پھر یہ بھی پہلے ہی کہہ دیا کہ تم کبھی مقابلے میں نہیں آ سکتے۔ اس کی کوئی مثال تحدی اور چیلنج کی دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہ اللہ کے کلام ہی کی شان ہے جو اتنا بڑا چیلنج ساری دنیا کو دے اور چیلنج کے ساتھ ساتھ یہ پیشین گوئی بھی کر دے کہ ساری دنیا بھی اگر چاہے کہ

سب کے سب مل کر اس چیلنج کو قبول کر لیں اور مقابلے کے میدان میں آجائیں تو کبھی نہ آسکیں گے۔ دنیا کے کسی انسان میں یہ ہمت نہیں کہ ایسا اور اتنا زبردست چیلنج ساری دنیا کو للکار کر دے۔

وقت کا تقاضا مذکورہ وجوہ کی بنیاد پر وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت دوسرے وجوہِ اعجاز جو عوام تو عوام ہیں، اہلِ نظر کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہو رہے ہیں، ان کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ خصوصاً وہ وجہ اعجاز جو مرورِ ایام کے بعد پیدا ہوئی، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، یہ نمایاں ہوتی گئی اور نمایاں تر ہوتی جاتی ہے، اس طرح کے گویا ہر ایک کے پیش نظر ہے۔ لیکن دنیا کی کم نظری کی وجہ سے بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ

از غایت ظہور نشانم پدید نیست

یہ وجہ اعجاز گو مرورِ ایام کے بعد پیدا ہوئی مگر اس کی تخم ریزی عہد نبوی میں آغاز نزول ہی کے وقت ہو گئی تھی اور برابر قدرت الٰہیہ کے غیبی ہاتھوں سے اس کی پرورش و پرداخت ہوتی رہی۔ کام کرنے والے ہاتھ بننا ہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تھے مگر ان کے مبارک ہاتھ محض آلے اور اوزار تھے۔ یہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم سے کتنا بڑا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ اپنا ایک فرض انجام دے رہے تھے۔ یہ نہیں سمجھتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے کہ قرآن کی یہ خدمت جو ان کے ہاتھوں سے انجام دلائی جا رہی ہے آئندہ چل کر آخر زمانے میں قرآن کا ایک زبردست معجزہ ثابت ہو کر رہے گی۔

ضرورت تو یہ ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے اہلِ علم و اہلِ قلم قرآن مبین کی سیاسی تعلیم، معاشرتی تعلیم، اقتصادی تعلیم، تمدنی تعلیم، قانونی تعلیم اور نفسیاتی تعلیم وغیرہ، ہر ایک کی معجزانہ شان کو اجاگر کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیں۔ یہ کام ایسا نہیں جس کو ایک شخص پوری طرح انجام دے سکے۔ اگر میری زندگی نے وفا کی اور توفیقِ الٰہی نے میری مدد فرمائی تو ان موضوعوں پر بھی اپنی بضاعت علمی کے مطابق کچھ لکھوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ

شاید آجائے کوئی ابلہ پا میرے بعد

اسوقت مصلحتِ وقت یہ ہے کہ سب سے پہلے میں قرآن مجید کے ایسے معجزے کو دنیا کے سامنے پیش کر دوں جو قرآن کا اصل دعویٰ ہے جس دعوے کو منوانے کے لئے قرآن نے ساری دنیا کو چیلنج کیا جس دعوے کو مختلف زمانوں میں مختلف حیثیتوں سے دنیا والوں نے تسلیم کیا، جن کی زبان ہٹ دھرمی وجہ سے اعتراف و تسلیم نہ کر سکی، ان کے دل نے ضرور تسلیم کر لیا۔

آج میں قرآن کے اس دعوے کا ثبوت اس کی ایسی نمایاں وجہ اعجاز کے ذریعے پیش کر رہا ہوں کہ اس کے معلوم کر لینے کے بعد کوئی عقل و ہوش والا انسان، اگر کچھ بھی صداقت اور دیانت رکھتا ہے، ہٹ دھرم نہیں ہے تو اس کو قرآن کے اعجاز کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

اللہ کے دعوے اور اللہ کے وعدے اللہ تعالیٰ نے قرآن مبین کے متعلق دو بہت اہم دعوے فرمائے۔ پہلا دعویٰ بہت زیادہ اہم ہے اس لئے اس کو بڑے زوردار طریقے سے پیش کیا اور اس کی دلیل میں چیلنج کا ایک پہاڑ منکرین کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہ پہلا دعویٰ تو یہ ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ یہ کتاب اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

دوسرا دعویٰ: لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔ باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے یہ ایک بڑی حکمت والے مستحقِ ہمہ ستائش کی طرف سے اُتری ہوئی کتاب ہے۔

دو وعدے

سب سے اہم اور زبردست وعدۂ الٰہی تو قرآن کی حفاظت کا ہے۔ فرمایا گیا

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ہم نے اس نصیحت والی کتاب کو اتارا ہے اور ہمیں اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

دوسرا اہم ترین وعدہ جو کئی وعدوں پر مشتمل ہے یوں فرمایا گیا:[1]

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ

میرے ہی ذمے اس کتاب کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا ہے

چونکہ یہ کتاب بیک دفعہ پوری کی پوری تعلیم و تبلیغ کے لئے نہیں اتری بلکہ اس کی آیتیں تھوڑی تھوڑی کرکے اتریں، اس لئے ان منتشر آیتوں کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ جمع کرا دینا اور اس پر ایمان لانے والوں سے اس کا پڑھوا دینا آسان کام نہ تھا تو فرمایا جاتا ہے کہ یہ کام ہمارا ہے اس کو جمع بھی کرا دیں گے اور لوگوں سے پڑھوا بھی دینگے۔ اس کے بعد وعدہ فرمایا جاتا ہے کہ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔ یعنی ہم نے جو تبلیغ قرآن کی خدمت تمہارے سپرد کی ہے۔ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ اتارا گیا ہے تم اس کو ان لوگوں کے سامنے واضح طور سے بیان کر دو تو تم سے اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔

دعوے اور وعدے تو اور بھی ہیں جن میں سے بعض اہم دعووں اور وعدوں کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔ اسوقت مذکورہ بالا دونوں دعووں اور دونوں وعدوں کو پیش کر کے ان پر سب سے پہلے بحث کرنا ہے مگر وعدے تو ہمیشہ آئندہ کے لئے ہوا کرتے ہیں، اور دعویٰ زمانۂ حال سے زمانۂ مستقبل کی لامعلوم مدت تک طول کھینچے ہوا ہوتا ہے، اس لئے دعویٰ عقلاً وعدوں پر تقدم اہمیت رکھتا ہے۔ اسی بنا پر میں سب سے پہلے اسی دعوے کو پیش کرتا ہوں جس کو خود اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیش فرمایا ہے یعنی

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ

یہ کتاب، اس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

لاریبیت

جن جن چیزوں میں لاریبیت کی صفت پائی جاتی ہے اور آپ ان کو لاریب فیہ سمجھتے ہیں۔ ان پر غور فرمایئے۔ آپ یا تو حواس خمسہ کے ذریعہ ان کو محسوس کر کے ان کے متعلق یقین حاصل کر لیتے، اس کے بعد اس کو لاریب فیہ سمجھتے ہیں یا کسی محسوس کی ہوئی چیز پر قیاس کر کے یقین حاصل کر لیتے ہیں، اور کسی چیز کو لاریب فیہ مانتے ہیں۔ مگر چکھنے کی چیز کا صحیح مزا آپ چکھ ہی کر لاریب فیہ کی حد تک جان سکتے ہیں۔ صرف دیکھ کر یا سونگھ کر آپ کو اس کے مزے کے متعلق وہ قطعیت علم حاصل نہیں ہوسکتی

---

[1] پہلے جمع کا ذکر فرمایا اس کے بعد قرآن یعنی پڑھوا دینے کا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ جمع قرآن حسب منشاء الٰہی کا کام آغاز نزول ہی کے وقت سے شروع ہو گیا تھا کیونکہ جب تک آیات مجتمع نہ ہوں سورتوں کا پڑھنا ہی ناممکن تھا ۱۲ منہ غفرلہ

جو جگہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھے گویّے کی خوش لحنی وخوش نوائی کو آپ صرف اُس کے لبوں کی حرکت، تو تان لیتے وقت منہ چیرنے اور گردن کی رگوں کے پھُلانے کو دیکھ کر لاریبیت کی حد تک کبھی نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ اس کی خوشنوائی اپنے کانوں سے سُن نہیں۔ وغیر ذٰلک۔ غرض جس حاسّے جس قوت ادراک سے جس چیز کی جس صفت کو محسوس اور دریافت کرسکتے ہیں جب تک اسی حاسے اور اسی قوت ادراک سے اس چیز کی اس صفت کو آپ محسوس و دریافت نہ کرلیں اس وقت تک اس چیز کو اس صفت کے ساتھ اس حد تک کبھی موصوف نہیں سمجھ سکتے کہ اس کے اس اتصاف کو آپ لاریب فیہ کہہ سکیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ چیز آپ کے سامنے موجود ہو یا موجود ہو سکے، یا آپ اس تک خود پہنچ سکیں۔ جو چیز نہ آپ کے سامنے موجود ہو سکے نہ آپ اس تک پہنچ سکیں، ایسی چیز کی لاریبیت آپ کو صرف ایک ہی ذریعہ سے پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے اور وہ ذریعہ صرف تواترِ خبر ہے۔ چاہے وہ چیز زمانہ موجودہ کی ہو، مگر آپ کی دسترس سے باہر ہو، چاہے وہ چیز زمانہ گذشتہ کی ہو اور زمانہ موجودہ میں اس کی صرف داستان رہ گئی ہو اور کچھ آثار باقی نہ ہوں، یا وہ اصل شے تو علی حالہ موجود ہو مگر اس کے متعلق کچھ باتیں کہی جاتی ہوں تو ان کا یقین بحد لاریبیت صرف تواتر ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اگر اس تواتر کے ساتھ ساتھ دوسرے دلائل بھی ہوں، قرائن بھی ہوں تو کیا کہنا ہے اور اگر اس تواتر خبر کے ساتھ عملی تواتر بھی ہو تو نور علیٰ نور ہے اگر اس بات کا تعلق عمل سے بھی ہے۔

غرض موجودہ زمانے کی محسوس چیزوں کا یقین بحد لاریبیت حواس خمسہ میں سے جس حاسے سے اس چیز کا تعلق ہے اسی حاسے کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور گذشتہ زمانے کی کسی چیز کے متعلق علم الیقین بحد لاریبیت صرف تواتر ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے تواتر نہ ہو تو فقط قرائن و دلائل سے بھی ہوتا ہے مگر ممکن نہیں کہ اس قدر نہ ہو۔

عہد نبوی میں تو رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے قرآنی آیات سن کر اس کے معنی مطلب سمجھ کر اہل عرب جو اس کے پہلے مخاطب تھے اس کی فصاحت و بلاغت، اس کے نصائح و مواعظ کے نفوذ فی القلوب اور اس کے اسلوب بیان کی دلکشی، پھر اس کی تحدی کے زور دار صلابت کو سُن سُن کر اس کی لاریبیت کے معترف ہو جاتے تھے۔ اہل تقویٰ و اہل صداقت ایمان لے آتے تھے اور ہٹ دھرم سرکش اور مغرور بلیلاتے تھے جس کا ثبوت تحدی اور چیلنج سن کر بھی ان کے مقابلے کے لئے نہ آنے سے مل رہا تھا۔ بعد والوں کے لئے تو پھر لوگوں سے تواتر کے ساتھ سننے رہا ہی ایک ذریعہ رہ گیا اس کی لاریبیت پر یقین لانے کا۔ اور اس تواتر کے ساتھ ساتھ اس کی تحدی جو قیامت تک کیلئے ہے، اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کو لاریب فیہ ثابت کر رہی ہے۔

تواتر کی تعریف

تواتر خبر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ آپ کوئی خبر بار بار اتنے لوگوں سے سُنیں کہ عقل اس کو تسلیم نہ کرے کہ اتنی بڑی جماعت اور اتنے لوگ خلاف واقعہ ایک غلط بات بلا وجہ ہم سے اور دوسروں سے متفق اللفظ ہو کر بیان کرینگے۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی ایک خیال کی یا ایک غرض کی ایک بڑی جماعت اپنی کسی غرض کے ماتحت باہم مشورہ کرکے ایک بالکل جھوٹی بات جی سے گھڑ کر اس طرح متفق اللفظ ہو کر متفرق جگہ جا جا کر بیان کرے اور اپنے ساتھ چند دوسری جماعت کے بھی سیدھے سادے لوگوں کے کان بھر کر ان کے ذریعے بھی اور بعض لالچی عیاروں کو کچھ دے کر ان سے بھی اس خلاف واقعہ بات کا اس طرح پروپگنڈہ

شہر شہر کرائے کہ عام سامعین کو اس خبر کے متواتر ہونے کا گمان ہونے لگے اور کچھ دنوں کے بعد یہ جھوٹا پروپاگنڈا ایک نہایت سچی اور متواتر خبر ہر خاص و عام میں سمجھی جانے لگے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں اس لئے خبرِ متواتر کی ابتدائے تواتر اور ابتدائے اشتہار کی نوعیت اور اس کے اشتہار کا منشاء، مشتہرین کی غرض، اس خبر سے مشتہرین کے کسی مفاد خصوصی و پوشیدہ سے تعلق کا پتا لگا لینا ضروری ہے۔ پھر تواتر کا خود بخود پیدا ہو جانا اور تواتر کا پیدا کرنا، دونوں کا فرق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تواتر کا آغاز جہاں کا واقعہ ہے وہاں سے شروع ہوا ہے یا کسی دوسری جگہ سے، یہ سب باتیں تواتر میں قابلِ غور ہیں۔ مثلاً واقعہ تو مدینہ کا ہو، مگر تواتر کا آغاز ہوا ہو کوفے اور بصرے سے۔ یا واقعہ ہو سنہ ۱۲ھ کا اور تواتر کا سرچشمہ دوسری صدی ہجری سے پھوٹے۔ اس قسم کے تواتر یقیناً کسی خلاف واقعہ ہی بات کے پھیلانے کے لئے بزور قائم کئے جاتے ہیں۔ ورنہ قصہ سرزمین بر سرزمین کے مطابق جہاں کا واقعہ ہے وہیں سے تواتر خبر کا آغاز ہونا چاہئے اور جس زمانے کا واقعہ ہو اسی زمانے میں اس کی شہرت سرزمین واقعہ پر عام ہونی چاہئے، اور پھر وہیں سے اس خبر کو الاقرب فالاقرب کے مطابق رفتہ رفتہ دور دور پھیل جانا چاہئے۔ یہ تو کوئی قابلِ وثوق بات نہیں کہ واقعہ کب کا اور اس کا چرچا شروع ہو کب، واقعہ کہاں کا اور اس کا پروپاگنڈا کیا جائے کہاں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک تواتر خبر کے خلاف دوسرا تواتر خبر پیش کیا جائے۔ ایسی صورت میں جو تواتر مقام وقت وقوع کی رعایت کے ساتھ عقل و درایت کے مطابق ہو گا وہی قابلِ قبول ہو گا۔ مکمل اور بدرجہ اتم، قابلِ قبول و موجب یقین تواتر وہی ہے جس کی خبر مختلف الخیال اور متغائر العقیدہ جماعت و افراد جن کو اصل واقعہ سے سروکار نہیں سب کو واقعہ کے وقوع کا اعتراف ہو۔

ممکن ہے کہ مخالفین کو جزئیات واقعہ یا سبب واقعہ جو بیان کئے جاتے ہیں ان سے کسی قدر اختلاف ہو مگر واقعہ سے مخالفین کو بھی اختلاف نہ ہو۔ جہاں کی بات ہو وہیں سے اس کے تواتر کا سلسلہ شروع ہوا ہو، اور جس زمانے میں اس کا وقوع ہوا ہو اسی زمانے سے اس کے تواتر کی بھی ابتدا ہوئی ہو۔ جس تواتر کا سرا ہی معلوم نہ ہو کہ کب سے آغاز ہوا اور کہاں سے شروع ہوا وہ تواتر عقلاً کوئی سند کوئی حجت اپنی صحت کے لئے نہیں۔ جب تک تواتر کا مبنیٰ معلوم نہ ہو اس وقت تک اس تواتر کا کوئی اعتبار نہیں۔

تواتر کی قسمیں اور قرآن مبین

۱۔ تواتر اسنادی، یہ مرکب ہے تین تواتر سے (الف) تواتر مسند (ب) تواتر مسند الیہ (ج) تواتر اسناد۔ مثلاً حافظ شیرازی کی ذات، ان کی شہرت شاعری کے وقت سے آج تک پورے تواتر کے ساتھ علم و ادب کی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح دیوانِ حافظ کی شہرت پورے تواتر کے ساتھ ساری دنیائے علم و ادب میں آپ دیکھ رہے ہیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حافظ شیرازی کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ دیوانِ حافظ کوئی کتاب ہی نہیں۔ دیوانِ حافظ کی نسبت حافظ شیراز خواجہ شمس الدین محمد کی طرف ہے۔ خواجہ حافظ مسند الیہ ہیں اور ان کا دیوان حافظ مسند۔ اس دیوان کی نسبت جو خواجہ حافظ کی طرف ہے وہ بھی تواتر تام کے ساتھ ہر جگہ مشہور و معروف ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دیوان کسی اور کا ہے جو حافظ شمس الدین شیرازی کی طرف غلطی سے منسوب ہو گیا ہے۔ جس طرح لوگ دیوان مخفی کو کہتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی بیٹی زیب النساء کا دیوان نہیں ہے۔ مخفی تخلص ایک درباری شاعر تھا یہ اس کا دیوان ہے جو زیب النساء کی طرف منسوب ہے۔ اسی طرح بعض لوگ کلیاتِ ظفر کے

بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ کا کلیات نہیں ہے بلکہ ابراہیم ذوق یا کسی اور کا ہے اس طرح کا شبہ کبھی کسی نے دیوانِ حافظ کے بارے میں نہیں کیا۔ اس لئے دیوانِ حافظ کی اسناد یعنی اس کی نسبت جو خواجہ شمس الدین کی طرف ہے وہ بھی متواتر ہے۔ اسی طرح قرآن مبین مسند ہے اس کا وجود قطعی اور ایسا متواتر کہ دنیا کی کسی کتاب کو بھی یہ تواتر حاصل نہیں۔ دنیا میں جتنے قلمی اور مطبوعہ قرآن مجید کے نسخے زمانہ خیر القرون یعنی پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی سے آج جو تاریخ یکم ماہ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ ہے اس وقت تک تقریباً پونے چودہ سو برس تک کے لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے جتنے نسخے دنیا میں ہیں اس کی عشر عشیر تعداد بھی کسی کتاب کی ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس پونے چودہ سو برس کی طویل مدت کا کوئی دن ایسا وہم میں بھی نہیں آسکتا جس میں دنیائے اسلام میں اس کی تلاوت اس کی قرارت، اس کے حفظ اس کی تعلیم، اس کی کتابت، اور اس کی طباعت (جب سے طباعت کا عام رواج ہوگیا) کسی نہ کسی جگہ نہ ہوتی ہو۔ اسلئے اس مسند یعنی اصل قرآن کے تواتر کا کیا پوچھنا ہے۔ باقی رہا مسند الیہ تو ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ تھا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور یہ قرآن مجھ پر اللہ کی طرف سے اترا ہے اور اسی پر تقریباً چودہ سو برس سے ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جو غیر مسلم عہد نبوی سے لیکر اس وقت تک دنیا سے گذر گئے اور جو اس وقت موجود ہیں ان میں کا ہر باخبر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ قرآن وہی ہے جس کے بارے میں آج سے پونے چودہ سو برس پہلے مکے کے رہنے والے محمد بن عبداللہ بن عبد المطلب ہاشمی قریشی کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے مجھ پر اتری ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ یہ ایک ایسی متواتر بات ہے جس کا انکار کبھی کسی زمانے میں بھی کسی نے نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کو یہ شبہ ہوا کہ محمد بن عبداللہ بن عبد المطلب جو مکے کے رہنے والے تھے جن کا دعویٰ تھا کہ میں اللہ کا رسول، وہ نبی ہوں جن کی رسالت اور نبوت پر دنیائے اسلام کا تقریباً چودہ سو برس سے ایمان ہے ان کی کوئی شخصیت ہی نہ تھی، اس کا کسی کو کبھی وہم بھی نہ ہوا نہ ہو سکا کہ یہ ایک فرضی نام ہے یا یہ کتاب بعد کو کسی نے تصنیف کرکے ان کی طرف منسوب کر دی تھی۔ غرض قرآن، جو مسند ہے، وہ قطعی و متواتر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مسند الیہ ہیں ان کی ذات مبارک قطعی و متواتر اور قرآن کی نسبت قرآن کی اسناد جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوئی ہے یہ اسناد قطعی و متواتر اور یہ تینوں قسم کا تواتر اس حد تک قطعی، واضح اور مکمل ہے کہ ایسی تکمیل تواتر کی مثال کسی دوسرے مسند، کسی دوسرے مسند الیہ اور کسی دوسری اس قسم کی اسناد میں دکھائی نہیں جا سکتی۔

(۲) تواتر مکانی: یعنی جو واقعہ جس بستی کا ہوتا ہے پہلے اسی بستی میں مشہور ہوتا ہے اور اہمیت کے مطابق اس بستی کے اکثر افراد یا ہر فرد کو معلوم ہو جاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے اور اس بستی کے قرب و جوار کے لوگ بھی اس سے واقف ہو جاتے ہیں اسی طرح اور آگے بڑھتا ہے اور پھر دور دور مشہور ہو جاتا ہے مگر جس قدر تواتر اس بستی کے افراد میں اس واقعہ کے متعلق ہوتا ہے دور کے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ زیادہ دور کے لوگوں میں بہت کم لوگ اس واقعہ سے باخبر ملیں گے۔ بلکہ زیادہ دور والوں میں واقعہ محض افواہ ہی کے طور سے ہوگا جس کو تواتر کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔

قرآن مجید کا یہ ایک خاص معجزہ ہے کہ اس کا مکانی تواتر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، وہ اتنا وسیع ہوا کہ ساری دنیا کے باخبر لوگ اس کے

اس کے اسنادی تواتر کے معتبر نہیں اور سب کے سب اس کی نغمہ سرائی میں ہم آہنگ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی۔

(۳) **تواترِ زمانی**: عموماً جو واقعہ جس زمانے میں ہوتا ہے اس کی اہمیت کے مطابق اس کا چرچا اسی زمانے میں زیادہ ہوتا ہے جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے، لوگ اس کو بھولتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر وہ بہت اہم واقعہ بھی ہے تو دو تین چار صدی یا اس سے کچھ زیادہ مدت کے بعد پھر وہ واقعہ محض ایک داستان ایک افسانہ ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر اس داستان کی مجموعی حیثیت کا زبانی یا کتب تواریخ میں تواتر ہو بھی تو اس کے جزئیات کی تفصیل یا تو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو طرح طرح کے اختلافات اور اوہام کے ساتھ جن کے متعلق وہ تواتر بھی صحیح طور سے باقی نہیں رہتا اور نقل اس کی صحت میں متامل ہوتی ہے۔

مگر قرآن مجید کا معجزانہ تواتر اس کی پہلی آیت کے وقتِ نزول سے شروع ہوا تو پھر ہر آیت اور ہر سورہ کا تواتر اس کے نزول کے وقت سے روز افزوں شہرت و شیوع کے ساتھ پھیلتا اور بڑھتا ہی رہا۔ آج پونے چودہ سو برس کے بعد بھی اس کا تواتر با خبر دنیا کے ہر گوشہ میں گونج رہا ہے۔ محض داستان و افسانے کے طور سے نہیں بلکہ واقعۂ صادقہ و حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے جس سے دنیا کا کوئی صاحبِ علم و خبر انکار نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا تواتر اسنادی اور اس کا تواتر مکانی و زمانی خود ایک معجزہ ہے جو اس کی لاریبیت کی واضح ترین دلیل ہے۔

(۴) **تواترِ ذاتی**: یعنی اصل شے اور اس کی ذات، اس کی ہیئت مجموعی اور اس کے اجزائے ترکیبی کا تواتر کہ جب سے قرآن کا نزول شروع ہوا اس وقت سے جیسے جیسے اس کی آیتیں مرتب ہوتی گئیں اور سورتیں بنتی گئیں، یا پوری سورتیں اترتی گئیں اور پھر سب کو مرتب و مدون کر کے رسول اللہ صلعم نے پوری کتاب اپنی امت کو دیدی اور اس کے ایک ایک حکم کی علمی و عملی تعلیم اور ایک ایک عقیدے اور وعظ و تذکیر کی تبلیغ فرما کر اپنے مفوضہ فریضۂ رسالت سے باحسن وجوہ سبکدوشی حاصل کی، اس وقت سے وہی کتاب اپنی اس ہیئت مجموعی اور سی ترکیب اجزائی کے ساتھ اس وقت تک بالکل اسی حالت و ہیئت میں مکمل تواتر کے ساتھ ہر ملک ہر بستی اور ہر محلے کے ہر مسلمان گھر میں ابا عن جد چلی آرہی ہے۔ اس کو تواتر سندی بھی کہا جا سکتا ہے جس کا بیان اوپر گذرا مگر وہاں اس کی اسنادی حیثیت دکھائی گئی تھی اور یہاں اس کی ذاتی صفت تواتر کو ثابت کیا گیا۔ اس لئے یہ تکرار مضمون نہیں ہے۔

(۵) **تواترِ اجزائی**: ایک تو تواتر مجموعی ہے، یعنی پورے مجموعے کا تواتر بحیثیت اس کی ذات کے اور پھر اس کی اسناد کے، وہ دونوں تو بیان ہو چکے۔ تواتر ذاتی اور تواتر اسنادی کے زیر عنوان، اسلئے تواتر مجموعی کا الگ عنوان قائم نہیں کیا، کہ ایک ہی مضمون کا اعادہ بے فائدہ ہوگا۔ مگر تواتر اجزائی کے ضمن میں تواتر مجموعی کا ذکر بھی ضروری ہے تاکہ آپ تواتر اجزائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

تواتر مجموعی سے میری مراد یہ ہے کہ ہر چیز کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں، انھیں اجزاء سے اس کی ذات مرکب ہوتی ہے اور انھیں اجزاء کے مجموعے کو آپ اس چیز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مکان کا تصور جب آپ کرتے ہیں تو اس مکان کے اجزاء یعنی دیوار، دروازے، چوکھٹ، کواڑ، کڑی، شہتیر، چھپر اور ستون سب کے مجموعے کا ایک نقشہ آپ کے سامنے آجاتا ہے۔ جب آپ کسی مکان کی نسبت کسی کی طرف کرتے ہیں کہ یہ مکان فلاں کا ہے تو یقیناً آپ اس مکان کی ہر دروازے اور دیوار کی ہر اینٹ، اس کی چوکھٹ، کواڑ، کڑی، شہتیر اور

ستون وغیرہ سب کی نسبتِ ملکیت بھی اسی شخص کی طرف قرار دیں گے کیونکہ کل کے ضمن میں اس کے اجزا بھی ہوتے ہیں، تو آپ دیوان حافظ کی نسبت جو خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کی طرف کرتے ہیں تو اس ضمن میں اس دیوان کے ہر قصیدے، ہر غزل بلکہ ہر شعر اور ہر شعر کے ہر لفظ کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ہر قصیدے، ہر غزل، ہر شعر اور ہر شعر کے ہر لفظ کی نسبت جو خواجہ حافظ کی طرف آپ سمجھتے ہیں تو یہ اس پورے دیوان کے ضمن میں سمجھتے ہیں اسلئے یہ ضمنی نسبت اتنی یقینی اور قطعی نہیں ہو سکتی جتنی پورے مجموعے کی نسبت قطعی اور یقینی ہے۔ چنانچہ دیوانِ حافظ کے بعض قصیدے کو اکثر محققین الحاقی کہتے ہیں اور بعض غزلوں اور شعروں کو بھی چنانچہ بعض قدیم نسخوں میں وہ قصیدے، وہ غزلیں اور وہ اشعار نہیں ملتے ہیں اس لئے ان الحاقی قصیدوں، غزلوں اور شعروں کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف یقینی وقطعی طور سے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی یہاں تک کہ حافظ کی پہلی غزل کا مقطع

حضوری گر ہمے خواہی، ازو غائب مشو حافظ
متیٰ ما تلق من تھوی دع الدنیا و اھملھا

اگر کوئی شخص کہے کہ اس مقطع کا دوسرا مصرع اس طرح حافظ شیرازی نے نہیں کہا تھا، ہم نے ایران کے شاہی کتب خانے میں خواجہ حافظ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کا دیوان دیکھا ہے جس میں انھوں نے اس مقطع کے دوسرے مصرع کو یوں لکھا ہے: دع الدنیا متی ما تلق من تھوی و اھملھا۔ تو آپ یقیناً فوراً مان لیں گے اور یقین کر لیں گے کہ خواجہ حافظ نے ضرور اسی طرح لکھا ہوگا بعد والوں نے نقل کرنے میں غلطی کی کیونکہ متی ما کے ماتحت جو شرط آئے اس کی جزا میں "ف" کا آنا ضروری ہے ہاں اگر جزا مقدم آجائے تو پھر "ف" نہیں آسکتی یعنی متی ما تلق من تھوی فدع الدنیا کہنا چاہیے تھا۔ مگر اس طرح مصرع موزوں نہیں ہوتا اور اگر دع الدنیا متی ما تلق من تھوی و اھملھا کہے تو وہ نحوی غلطی نکل جاتی ہے اور مصرع بھی موزوں ہو جاتا ہے۔ اس لئے آپ کا یہ سمجھنا کہ عام طور سے یہ مقطع جس طرح ہر دیوان قلمی ومطبوعہ میں نظر آتا ہے غلط ہے حافظ شیرازی نے اس طرح نہیں کہا ہوگا اور یہ شخص جو ایران سے شاہی کتب خانے میں خواجہ حافظ کے دست خاص سے لکھے ہوئے دیوان کو دیکھ کر آیا ہے اور اس میں دیکھ کر جو کہہ رہا ہے وہی صحیح ہے اور اسی کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف صحیح ہے اور عام نسخوں میں جس طرح ہے اس کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف صحیح نہیں۔ یہاں تو ایک نحوی غلطی بھی آپ کو یہ سمجھنے پر مجبور کرے گی، اگر نحوی غلطی نہ ہو جب بھی دوسروں کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اور مطبوعہ نسخوں سے اور خاص مصنف کے یا اس کے کسی شاگرد رشید یا خلف الصدق کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے میں کچھ فرق ہو تو ہر شخص خاص مصنف یا اس کے شاگرد یا بیٹے کے لکھے ہوئے نسخے کو دوسروں کے لکھے ہوئے نسخوں سے زیادہ صحیح ماننے پر مجبور ہوگا اس لئے کہ تواتر پورے مجموعے کی نسبت کا ضرور ہے مگر اس کے ہر جزء کا تواتر اسناد، اس کے مسند الیہ کی طرف مستقل طور سے نہیں ہے۔ اگر ہے تو پورے مجموعے کے ضمن میں ہے۔

مگر قرآن مجید کا تواتر اسنادی کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کتاب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری ہے جس طرح پورے مجموعے کے متعلق ہے بالکل اسی طرح اس کے ہر سورے ہر آیت، ہر جملے اور ہر جملے

(باقی آئندہ)